دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

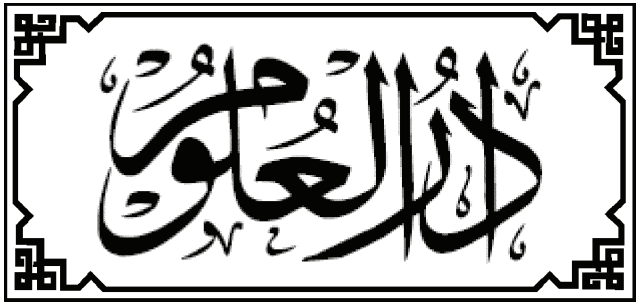

جلد: ۹۴	صفر-ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ مطابق فروری ۲۰۱۰ء	شمارہ: ۲

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵روپئے، سالانہ-/۱۵۰روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	آپریشن سے متعلق جدید مسائل	حذیفہ وستانوی	۶
۳	''اسلام میں عورتوں کے حقوق''...	مولانا تنویر خالد قاسمی	۱۸
۴	دینی مدارس میں قواعد فقہ کی تعلیم	اشتیاق احمد قاسمی	۲۵
۵	پہلا صلیبی سامراج (۱)....	عبدالمتین منیری، بھٹکل	۳۳
۶	میرے قابل احترام اساتذۂ کرام...	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	۴۲
۷	مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب....	حکیم عبدالحمید صاحب	۴۸
۸	تعارف وتبصرہ	مولانا اشتیاق احمد	۵۳

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

برصغیر یعنی متحدہ ہندوستان کی علمی وثقافتی تاریخ سے واقف اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلم دور اقتدار میں اسلامی علوم وفنون کے تحفظ وترویج اور تعلیم وتدریس کا بڑی حد تک انحصار مسلم حکمرانوں اور نوابین وامراء کی علم پروری، علماء نوازی اور داد ودہش پر تھا، ہر شہر وقصبات میں سلاطین اور امراء کی جانب سے تعلیم گاہیں اور مدرسے قائم تھے، جن کے مصارف کی ادائیگی ان کی جیب خاص یا سرکاری خزانوں سے ہوتی تھی، چنانچہ اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، دکن، گجرات، مالوہ، ملتان، لاہور، کشمیر وغیرہ میں اس قسم کی ہزاروں درسگاہیں تھیں، ان باضابطہ مدارس کے علاوہ علماء وفضلاء شخصی طور پر بھی اپنے اپنے مستقر اور قیام گاہوں پر درس وتدریس اور اسلامی فنون کی اشاعت کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، اس عہد کی علمی وثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل مولانا سید عبدالحئی رائے بریلوی، کی تصنیف ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' اور مولانا سید مناظر حسن گیلانی کی کتاب ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم کسی نہ کسی حد تک ۱۸۵۷ء تک قائم رہا، اس نظام تعلیم میں عام طور پر صرف ونحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف تفسیر وحدیث وغیرہ کے علوم وفنون پڑھے پڑھائے جاتے تھے، البتہ تفسیر وحدیث کی بجائے فقہ واصول فقہ پر توجہ زیادہ دی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب برصغیر سے مسلم حکومت ختم ہوگئی اور سیاسی اقتدار پر برطانوی سامراج کا قبضہ ہوگیا تو یہاں کے باشندے اور بطور خاص مسلمان ''إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً'' الایۃ (جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد اور اس کے باعزت باشندوں کو ذلیل کرڈالتے ہیں) کے فطری اصول کا تختۂ مشق بن گئے۔

اس سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کے اقتصادی، تمدنی اور علمی ودینی نظام کو کس طرح پامال

کیا اس کی تفصیل ایک انگریز سربراہ ''سرولیم ہنٹر'' نے اپنی کتاب ''انڈین مسلمانز'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کسی قدر ذکر کی ہے، اس کتاب میں مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کردیا ہے، دوسرے ایسا طریقۂ تعلیم جاری کردیا ہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کردیا ہے، چوتھے ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہورہی ہے۔'' (موج کوثر ص:۴۷)

تعلیم سے متعلق اس نئی سامراجی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہنی وفکری طور پر بالکل انگریز یا کم از کم ایمان دار ومحنتی رعایا بن جائیں، چنانچہ مسٹر انفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

''میں علانیہ نہیں تو در پردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا، اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے، تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی نہ ہوسکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایماندار محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے'' (روشن مستقبل ص:۹۵)

اس سلسلے کی تفصیلات کیلئے ''اسباب بغاوت ہند از سرسید رحمہ اللہ، روشن مستقبل از مولوی سید طفیل احمد رحمہ اللہ اور نقشِ حیات ج ۲ از شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ وغیرہ دیکھی جائیں۔

سامراجی حکومت کے پیدا کردہ یہ وہ ناگفتہ بہ حالات تھے جس میں اپنے دین ومذہب، عقائد واخلاق اور تہذیب وثقافت کی حفاظت اور بقا کے لئے خانوادۂ ولی اللّٰہی سے متعلق اس وقت کے بالغ نظر علماء دین نے آزاد دینی تعلیم گاہوں اور مدارس اسلامیہ کے قیام کا فیصلہ کیا، علماء کی اس جماعت کے سامنے مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی بھی تھی، لیکن اس نے اولیت ایمانیات وروحانیات کو دی، مسلم مفکرین ومدبرین کی اس جماعت کے سرخیل ومیر کارواں حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے اور نقطۂ نظر کا مظہر اولین ''دارالعلوم دیوبند'' ہے، جس کی حصولیابیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ''پیامِ ندوہ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے کوئی ہوش مند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت، تحریف، اور باطل تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام و بقا واستحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔''

آج کے ازاد ہندوستان میں مسلمانوں کے جو دینی تعلیمی ادارے ہیں وہ درحقیقت اسی تحریک کی پیداوار ہیں اور اپنے اپنے وسائل وذرائع کے مطابق سرکاری امداد وتعاون سے بے نیاز ہوکر اسلامی علوم وفنون اور دینی عقائد واعمال کی ترویج واشاعت میں مصروف عمل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہم ایک سیکولر اسٹیٹ کے شہری ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ سچ یہ ہے کہ ہم اور ہماری قومی حکومت لامذہب نہیں ہے نہ یہاں کے حکام لامذہب ہیں اور نہ عوام اور نہ ہی جمہوری نظام، اسٹیٹ کے لامذہب ہونے کا مطلب بس یہ ہے کہ یہ ریاست کسی ایک مذہب کی ملکیت نہیں ہے بلکہ ہر مذہب اور ہر مذہب کے لوگ اس کے مالک ہیں، اسے لامذہب صرف اس لئے کہا جاتا ہے، تاکہ کوئی مذہب اپنے غلبہ اور اپنی عددی اکثریت کی بناء پر راج گرو ہونے کا دعویٰ نہ کرے۔

ہمارے ملک کا دستور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بہت سارے مذاہب جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک سیکولر اسٹیٹ میں اپنے مذہبی اقدار سے وابستہ رہتے ہوئے ترقی کرسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ سیکولرزم صحیح ہو اور جمہوریت کے لئے ہمارا دل پاک صاف ہو مذہبی بنیادی تعلیم ہر بچہ کا پیدائشی حق ہے، یہ حق اور فرض کا معاملہ ہے۔ جس سے سب کا فائدہ اور کسی کا نقصان نہیں ہے۔ اسلئے ہم اپنی سیکولر قومی حکومت کے سیکولر وزیر تعلیم سے کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ذہنی تحفظات، اور مخفی عزائم کے تحت ''مدرسہ بورڈ'' کے دام ہم رنگ ذہن کے ذریعہ مسلم بچوں سے ان کے بنیادی مذہبی حق کے حصول میں خلل اندازی نہ کریں یہی ملک کے دستور اور سیکولر نظام کا تقاضا ہے اور سامراجی حکومت کی طرح مسلم اقلیت کی مذہبی ودینی تعلیم گاہوں میں ایسا طریقۂ تعلیم جاری کرنے کی کوشش نہ کریں جس سے ان مدرسوں کے قیام کا مقصد فوت ہوجائے بالفاظ دیگر ان مدارس دینیہ کو کالج بنانے کی لاحاصل سعی میں اپنے قیمتی وقت اور سرکاری دولت وطاقت کو رائگاں نہ کریں ملت اسلامیہ اسے کسی قیمت پر بھی تسلیم نہیں کرسکتی۔

❁ ❁ ❁

قسط اوّل

آپریشن سے متعلق جدید مسائل

حذیفہ وستانوی

مسائل

(۱) شریعت اسلامیہ نے علم طب سیکھنے، سکھانے، اوراس کے اطلاق کو نہ صرف مباح بلکہ مصالح عظیمہ ومنافع جلیلہ یعنی صحت کی حفاظت، اورامراض کے ضرر سے بدن کو بچانے کی بناء پر فرض کفایہ قرار دیا ہے۔(احکام الجراحۃ الطبیۃ،ص:۷۷)

(۲) اعضاء انسانی کی چیر پھاڑ کرنا ناجائز وحرام ہے، البتہ بوقت ضرورت علماء کرام نے میڈیکل سرجری (آپریشن) کرنے کی اجازت دی ہے۔(ص:۸۴)

مسئلہ : میڈیکل سرجری بسا اوقات مریض کی موت وہلاکت، یا کسی عضو کے تلف ہونے کا سبب بن جاتی ہے، اسلئے فقہاء کرام نے اس کی مشروعیت وجواز کیلئے آٹھ شرطیں بیان کی ہیں، (۱) سرجری مشروع وجائز ہو، (۲) مریض سرجری کا محتاج ہو، (۳) مریض اس کی اجازت دے، (۴) سرجن اوراس کے اعوان واہلکاروں میں اہلیت کاملہ موجود ہو، (۵) سرجن کو سرجری کے کامیابی کا غالب گمان ہو، (۶) سرجری کا ایسا متبادل نہ پائے جو ضرر میں اس سے خفیف ہو، (۷) سرجری پر مصلحت مرتب ہو، (۸) سرجری کی وجہ سے ایسا ضرر لاحق نہ ہو جو موجودہ بیماری کے ضرر سے بڑا ہو۔

مسئلہ : اگر تجربہ کار سرجن کو میڈیکل سرجری کی وجہ سے مریض کے ہلاک ہونے کا غالب گمان ہو تو اس وقت میڈیکل سرجری حرام ہوگی۔(۱۰۲)

مسئلہ : اگر مریض میں اہلیت اذن نہ ہو، تو اسکے ولی کی اجازت کافی ہے۔(ص:۱۰۹)

مسئلہ : سرجن میں اہلیت کاملہ کیلئے دو شرطیں ہیں: (۱) وہ مطلوبہ سرجری میں علم و بصیرت رکھتا ہو، (۲) اس کی تطبیق اور بہترین طریقے سے اسے پورا کرنے پر قادر ہو۔(ص:۱۱۲)

مسئلہ : سرجن میں اہلیت کاملہ ہونے کے باوجود وہ آپریشن میں کامیاب نہ ہو، اور

آپریشن سے مریض کو ضرر لاحق ہوجائے، یا وہ مرض دوسرے اعضاء کی طرف سرایت کرجائے تو سرجن ضامن نہیں ہوگا۔(ص:۱۱۳)

مسئلہ :اگر سرجری پر مرتب ہونے والا ضرر موجودہ مرض کے ضرر سے بڑھ کر ہو، تو ایسی سرجری کرنا، وکرانا دونوں حرام ہیں، کیوں کہ قاعدہ فقہیہ: ''الضرر لا یزال بمثلہ'' کہ ضرر کو ضرر سے زائل نہیں کیا جاتا۔(ص:۱۲۴)

مسئلہ :اگر سرجری پر مرتب ہونے والا ضرر موجودہ مرض کے ضرر سے کم ہو تو ایسی سرجری کرنا وکرانا دونوں جائز ہیں، اسلئے کہ قاعدہ ہے: ''**إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمها ضرراً بإرتكاب أخفهما**'' ، کہ جب دو ضرر جمع ہوجائیں تو ان دونوں میں سے اُخف کو اختیار کرلیا جائے گا۔(ص:۱۲۴)

سرجری (آپریشن) کی قسمیں باعتبار رحلت وحرمت

مسئلہ : چھ قسم کی سرجری جائز ہے، اور بسا اوقات سرجری کرنا لازم وضروری بھی ہوتا ہے:

(۱) عمل جراحی (Opration) بر بنائے علاج: وہ آپریشن جو بغرض علاج کے کیا جائے۔

(۲) عمل جراحی برائے تشخیص امراض: (Surgical Diagnosis) وہ سرجری جو تشخیص مرض کیلئے کی جائے۔

(۳) عمل جراحی برائے ولادت: (Surgical Accouchment)

وہ سرجری جو بوقت ولادت، حاملہ، اور جنین یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہلاکت سے بچانے کے خاطر کی جائے۔

(۴) عملِ جراحی برائے ختنہ: (Surgical Phimosiectomy) ختنہ کرنا۔

(۵) جراحتِ دماغ صغیرہ برائے عمل (پریکٹیکل): (Small Brain Practical Operation)

وہ سرجری جو لاشوں پر بطور پریکٹکل کی جاتی ہے۔

(۶) جراحی حسن وزیبائش (Cosmetic Surgery) بر بنائے ضرورت وحاجت: وہ سرجری جو بوقت حاجت اعضاء سے ضرر کو دور کرنے کیلئے کی جاتی ہے، اور نتیجۃً اس سے حسن حاصل ہوتا ہے۔

میڈیکل سرجری (Medicul Surgery) کی قسموں کا بیان مع تعریفات واحکام

(الف) عمل جراحی (Esseulial Surgery) بر بنائے علاج وضرورتِ شدیدہ: مریض کی حالت بر بنائے مرض اتنی خستہ ہوچکی ہو کہ اگر سرجری نہ کی جائے تو اسی مرض میں مریض کی موت واقع ہوجائے تو اس مرض کو دور کرنے اور اپنی جان کی حفاظت کیلئے سرجری کرنا فرض ولازم ہے، اس طرح کی سرجری کو الجراحۃ العلاجیۃ الضروریۃ کہا جاتا ہے۔ (ص:۱۳۳/۱۳۴)

(ب) عمل جراحی (Esseulial Surgery) بر بنائے علاج وضرورتِ خفیفہ: وہ بیماری جس میں مریض کی موت وہلاکت کا خوف ہو، یا اس مرض کی شدت میں اضافہ کا خوف ہو، تو ایسے بیماری کو ختم کرنے کیلئے جو سرجری کی جاتی ہے اس کو ''الجراحۃ العلاجیۃ الحاجیۃ'' کہتے ہیں۔

اس سرجری کی دو قسم ہے:

(۱) ایسی بیماری جس کی وجہ سے مریض کو سخت ضرر پہونچتا ہو، خواہ وہ ضرر دائمی ہو یا وقتی ہو۔ ایسی بیماری، جس سے فی الحال اس کا کوئی ضرر نہ ہو، لیکن مستقبل میں ضرر کا خوف ہو، اور اس خوف کا حدوث متوقع ہو، شک اور وہم کے درجہ میں نہ ہو، بایں طور کہ اگر سرجری نہ کیجائے تو یہ مرض اس کے کسی عوض کو لاحق ہو کر اس عضو کی منفعت کو بالکلیہ ختم کردے۔ (ص:۱۴۰/۱۴۴)

ایسے مریض کیلئے ان حالتوں میں سرجری کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے۔

(ج) جراحات صغری برائے علاج ومعالجہ: (Minor Surgery) ایسی بیماری کا آپریشن کرنا جو نہ ضرورت کے درجے کو پہونچے اور نہ حاجت کے، بایں طور کہ وہ مرض انسان کو نہ موت تک پہونچا سکتا ہو اور نہ اس میں موت کا خوف ہو، لیکن اس مرض کو یونہی چھوڑے رکھنا تکلیف وپریشانی کا سبب بن سکتا ہو، اور یہ تکلیف وپریشانی متوقع ہو، جیسے ناک میں زائد گوشت کا بڑھ جانا، اگر اس زائد گوشت کو نہ نکالا جائے تو یہ بڑھ کر تکلیف ومشقت کا سبب بن سکتا ہے، اسلئے آپریشن کی یہ صورت شرعاً جائز ہے۔ (ص:۱۴۸/۱۴۹)

(۲) عمل جراحی برائے تشخیص امراض: (Surgical Diagnosis) ایسی سرجری جس سے مرض کی تشخیص کی جاتی ہے، شرعاً یہ سرجری جائز ہے، لیکن اگر مرض کی تشخیص کیلئے کوئی آسان متبادل شکل موجود ہو، جیسے سونوگرافی وغیرہ تو پھر اس صورت کو اختیار کرنا جائز نہیں ہوگا۔

(ص:۱۵۱/۱۵۳)

(۳) عمل جراحی برائے ولادت (Surgical Accouchment): وہ سرجری جس میں بذریعہ آپریشن بچے کو اس کے ماں کے پیٹ سے نکالا جاتا ہے، خواہ وہ کامل الخلقت ہو، یا ناقص الخلقت ہو، اس سرجری کی دو حالتیں ہیں:

(۱) **حالت ضروریہ**: یہ وہ حالت ہے جس میں بچہ یا حاملہ دونوں کی یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی جان خطرے میں ہو، اس حالت میں سرجری کرنا جائز ہے، جیسے حاملہ کی وفات کے بعد اگر جنین زندہ ہو تو اس حالت میں بذریعہ آپریشن بچہ کا نکالنا جائز ہے۔

(۲) **حالت حاجیہ**: یہ وہ حالت ہے کہ طبعی طور پر بچے کی ولادت متعذر ہونے کی وجہ سے بطریق سرجری بچے کو نکال لیا جاتا ہے، اس طرح نہ کرنے کی صورت میں بچے یا حاملہ کی ہلاکت کا خوف ہوتا ہے، اس حالت کا حکم ڈاکٹر (آپریشنر) کی تقدیر رائے پر موقوف ہے، اگر ڈاکٹر کو عورت کے ولادت طبعی کی مشقت برداشت نہ کرنے، یا پھر بچے کو ضرر لاحق ہونے کا گمان غالب ہو، تو اس صورت میں بچے کو بذریعہ سرجری نکالنا جائز ہے، اور اگر ڈاکٹر کا غالب گمان اس کے برعکس ہو تو سرجری کرنا جائز نہیں ہے۔ (ص:۱۵۸)

(۴) عملِ جراحی برائے ختنہ (Surgical Phimosiectomy): وہ سرجری جس میں مرد کے عضوِ خاص کی اس چمڑی کو جو حشفہ کو چھپائے ہوتی ہے، اور عورت کے فرج کے اعلی حصہ کے ادنی جز کو کاٹا جاتا ہے، احناف کے نزدیک ختنہ کرنا مسنون ہے۔ (ص:۱۵۹)

اس لئے سرجری کی یہ صورت نہ صرف جائز بلکہ مسنون ہے۔

(۵) جراحی تشریح الأعضاء (Surgical Anatomy): وہ سرجری جو فن طب میں نظری وعملی اعتبار سے مہارت حاصل کرنے کیلئے مردہ لاشوں پر بطور پریکٹیکل کی جاتی ہے، اس سرجری کے جواز وعدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔

قول اول: علم طب سیکھنے کی غرض سے مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا جائز ہے اس کے قائلین:

(۱) هيئة كبار العلماء بالمملكة العربية السعودية، (۲) مجمع الفقه الإسلامي بمكة المكرمة ، (۳) لجنة الإفتاء بالمملكة الأردنية الهاشمية ، (۴) لجنة الإفتاء بالأزهر بمصر.

قول ثانی: بغرض تعلیم مردہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرنا جائز نہیں ہے، اور اس کے قائلین بھی علماء

کی ایک جماعت ہے، جیسے: **شیخ محمد بخیث المطیعی، والشیخ محمد برھان الدین السنبلی.**

نوٹ: یہی رجحان علماء دیوبند کا ہے، کہ انسان کی لاش کی چیر پھاڑ کرنا جائز نہیں ہے، اس کی تفصیل دیکھیئے: (منتخبات نظام الفتاوی: ۴۱۲/۱، فتاوی محمودیہ: ۳۴۳/۱۸، جدید مسائل کا حل: ۹۹، احسن الفتاوی)

مسئلہ: لاش کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے، خواہ لاش مسلمان کی ہو یا کافر کی ہو، اس لئے کہ صحت بیع کیلئے مبیع کا بائع کی ملک میں ہونا، یا بائع کا اس مبیع میں وکیل ہونا شرط ہے، اور یہاں لاش نہ بائع کی ملک ہوتی ہے، اور نہ بائع اس کے مالک کی جانب سے وکیل ہوتا ہے، اسلئے شرعاً لاش کی بیع وشراء جائز نہیں ہے۔ (ص: ۱۸۰)

حیلہ: صاحب ''احکام الجراحۃ الطبیۃ'' نے لاش حاصل کرنے کا ایک جائز طریقہ ذکر کیا ہے، کہ لاش لینے والا لاش دینے والے سے عقد اجارہ کرلے، اور لاش کی قیمت کو لاش دینے والے کی محنت، تلاش اور نقل وحرکت کی اجرت قرار دے۔ (ص: ۱۸۰)

مسئلہ: جنائی پوسٹ مارٹم، (تحقیق جرائم کیلئے کیا جانے والا پوسٹ مارٹم) اور وہ پوسٹ مارٹم جو اسبابِ موت کو معلوم کرنے کیلئے کیا جاتا ہے، اس خوف سے کہ اس کی موت کا سبب کوئی وبائی مرض ہو، تو اس مرض کو معلوم کرکے دوسروں کے صحت کی حفاظت کی جائے، پوسٹ مارٹم کی ان دونوں قسموں کے بارے میں مملکت سعودیہ عربیہ کے علماء عظام نے ان کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (ص: ۱۸۱)

(۶) **جراحۃ التجمیل الحاجیۃ**: جب انسان کے کسی عوض میں کوئی نقصان پیدا ہو، یا کوئی عضو تلف ہوجائے، یا مسخ ہوجائے، تو اس کی درستگی کیلئے سرجری کرانا جراحۃ التجمیل الحاجیۃ کہلاتا ہے۔

اس کی دو قسم ہے: (۱) ضروری (۲) اختیاری

(۲) ضروری: ان عیوب کی سرجری کرانا جو انسان کیلئے باعثِ ضرر ہو، خواہ وہ عیوب پیدائشی ہوں، جیسے: اوپر کے ہونٹوں کا پھٹا ہوا ہونا، اور ہاتھ، پیر کی انگلیوں کا ملا ہوا ہونا، یا وہ عیوب بعد میں پیدا ہونے والے ہوں، جیسے: آگ میں جلنے کی وجہ سے جلد کا خراب ہونا، اور ہتھیلی کی انگلیوں کا مل جانا، یہ عیوب ضرر حسی ومعنوی دونوں کو شامل ہیں، اور ضرر موجب ترخیص ہے، لہٰذا یہ

بمنزلۂ حاجت کے ہے، اور حاجت کبھی بمنزلۂ ضرورت ہوتی ہے، بر بنائے قاعدہ فقہیہ: ''الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ کانت أوخاصۃ''، لہٰذا ان عیوب کو دور کرنے کیلئے سرجری کرنا جائز ہے۔

سرجری کی اقسام باعتبار حرمت

باعتبار حرمت کے سرجری کی تین قسمیں ہیں:

(۱) عملیۂ خوش وضعی، عملیۂ خوشنمائی (Shapely Surgery)

(۲) عملیۂ تبدیلیٔ جنس (Sex Changing Surgery)

(۳) عملیۂ حفظ ماتقدم ''عملیہ تحفظی'' (Bullet Proof Surgery)

عملیہ خوش وضعی، عملیۂ خوشنمائی (Shapely Surgery): وہ سرجری جو اعضاء کی خوبصورتی، یا بڑھاپے کو زائل کرنے کیلئے کی جاتی ہے۔

اس جراحت کی دو قسم ہے:

(۱) عملیۂ جراحی برائے شکل سازی (Shape Making Surgery): شکل وصورت بدلنے والی سرجری، جیسے: تغییر کرکے آنکھ کو خوبصورت بنانا، ٹھوڑی کو خوبصورت بنانا۔

(۲) عملیۂ شباب آور، عملیہ تشبیب، عملیہ شباب ساز (Young Making Surgery): وہ سرجری جو بڑھاپے کے آثار چھپانے کیلئے کی جاتی ہے۔

اس قسم میں سرجری کیلئے نہ کوئی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ کوئی حاجت ہوتی ہے، بلکہ محض تغییر فی خلق اللہ ہوتا ہے، اور اپنی خواہش وشہوت کو پورا کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس طرح کی سرجری کرنا غیر مشروع وناجائز ہے۔ (ص: ۱۹۱/۱۹۳)

عملیۂ تبدیلیٔ جنس (Sex Changing Surgery) وہ سرجری جس میں مرد کو عورت اور عورت کو مرد بنایا جاتا ہے، اور یہ عمل بہت سے محرمات پر مشتمل ہے، مثلاً: تشبہ من جنس غیرہ، اور غیر کے سامنے بلاضرورت اپنے ستر کو کھولنا، اور ان کی حرمت قرآن وحدیث سے صراحۃً ثابت ہے، ان وجوہات کی بناء پر فقہاء نے اس سرجری کو حرام قرار دیا ہے۔

عملیۂ حفظ ماتقدم ''عملیہ تحفظی'' (Bullet Proof Surgery): ایسی بیماری کی سرجری کرنا جس میں مستقبل میں ضرر لاحق ہونے کا احتمال ہو، اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) احتمال، غلبۂ ظن کے درجہ کا ہو تو اس کا حکم گزر چکا ہے۔

(۲) احتمال، محض وہم اور شک کی حد تک ہو، جیسے: صحت وتندرستی کی حالت میں محض

مستقبل میں ضرر کا خوف کرتے ہوئے اپنڈیکس کا آپریشن کرنا، حرام ہے، اس لئے کہ حکم شرعی یقین پر دائر ہوتا ہے، شک اور وہم پر نہیں۔

مسئلہ : ایکسرے کے ذریعہ سے طبی جانچ کرانا بہت ساری خرابیوں پر مشتمل ہے، مثلاً: جلد کے خراب ہونے کا خطرہ ہے، اور بعض کتابوں میں اسے کینسر اور دیگر امراض کے پیدا ہونے کا سبب بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود بوقت حاجت جب کہ تشخیص مرض کا کوئی متبادل موجود نہ ہو، تو شریعت نے ایکسرے نکالنے کی اجازت دی ہے، جیسے: پیٹ، تلی اور پتے وغیرہ کے امراض میں۔

تشخیص کے احکام

مسئلہ : تشخیص وہ فن یا وہ راستہ ہے، جس سے مرض کی نوعیت کا جاننا آسان ہوتا ہے، تشخیص کی یہ تعریف دو باتوں پر مشتمل ہے، (۱) تشخیص طب کا ایک فن ہے، (۲) تشخیص کا مقصد مرض کو پہچاننا، اور یہ دونوں چیزیں بڑی اہم ہیں، اس فن کو حاصل کرنے کیلئے اس کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی صحبت اختیار کرنا ضروری ہے، اس فن کو سیکھے بغیر مرض کی تشخیص کرنا جائز نہیں ہے۔ (ص:۲۳۲، ۲۳۳)

مسئلہ : تشخیص سے حاصل ہونے والے علم کی چار صورتیں ہیں:

(۱) مرض کا یقین ہو، تو اس یقین کے مطابق اس مرض کا جو بھی علاج ہو کرنا درست ہوگا، اگر چہ سرجری ہو۔

(۲) مرض کا ظن غالب ہو، اس صورت میں ظن غالب کا اعتبار ہوگا، شک کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا، اور علاج کرنا جائز ہوگا، اگر چہ سرجری ہو۔

(۳) مرض کا شک ہو، اس صورت میں توقف کرے، اگر مریض یا ڈاکٹر شک والی تشخیص کو بنیاد بنا کر سرجری کرنا چاہے تو جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ شک والا پہلو ختم ہو کر کسی جہت کا غالب گمان ہو جائے۔

(۴) مرض کا وہم ہو، اس صورت میں بھی طبیب اور مریض کیلئے مرض موہوم کا آپریشن سے علاج کرنے کی اجازت نہیں ہے، اسلئے کہ اس صورت میں غالب گمان بیماری کا نہ ہونا ہے، اور اعتبار غالب گمان کا ہوتا ہے۔ (ص:۲۳۵/۲۴۰)

مسئلہ : سرجری کے مباح ہونے کیلئے اذن شرع واذن مریض یا ولی، دونوں کا ہونا ضروری ہے، اذن شرع سے مراد اس سرجری کا محرمات میں سے نہ ہونا۔ (ص:۲۴۰)

مسئلہ : میڈیکل سرجری کیلئے اجازت دینے کی دوقسمیں ہیں:

(۱) اذن مطلق: وہ یہ ہے کہ مریض ڈاکٹر سے کہے کہ آپ جو بھی مرض پائیں اس کا جس طرح علاج کرسکتے ہیں، میری جانب سے اس کی اجازت، کسی ایک مرض کی سرجری کے ساتھ مقید نہ کرے۔

(۲) اذن مقید: وہ یہ ہے کہ مریض ڈاکٹر کو کسی خاص مرض کے سرجری کی اجازت دے، اجازت کی دونوں قسمیں شرعاً معتبر ہیں۔ (ص:۲۴۲)

مسئلہ : مریض کی اجازت قبول کرنے کیلئے اس میں دوشرطوں کا پایا جانا ضروری ہے: (۱) اہلیت (۲) ابتداء اذن پر مریض کا قادر ہونا۔ (ص:۲۴۴)

مسئلہ : اگر مریض کے اندر یہ دوشرطیں پائی جائیں تو اس کے اولیاء کی اجازت قابل قبول نہیں ہوگی۔ (ص:۲۴۵)

مسئلہ : ولایت علی الغیر اس وقت معتبر ہے جبکہ وہ غیر اپنے مصالح کو پورا کرنے سے عاجز ہو۔ (ص:۲۴۶)

مسئلہ : مریض پر ولایت کا اعتبار اسی وقت ہوگا جبکہ مریض میں اہلیت اذن نہ ہو۔ (ص:۲۴۶)

مسئلہ : اذن میں اولیاء کی ترتیب وہی ہوگی جو عصبیت میں ہوتی ہیں۔ (ص:۲۴۸)

مسئلہ : اگر اولیاء میں ولی اقرب موجود ہو تو ولی ابعد کی اجازت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (ص:۲۴۹)

مسئلہ : آذن (یعنی اجازت دینے والا) عاقل، بالغ ہو۔ (ص:۲۵۰)

مسئلہ : بچے، مجنون، اور نشے میں چور شخص کی اجازت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ (ص:۲۵۰)

اجازت قبول کرنے کی چھ شرطیں ہیں:

(۱) اجازت صاحب حق کی جانب سے ہو، اور وہ مریض یا اس کا ولی ہے۔

(۲) اجازت دینے والے میں اہلیت اذن متحقق ہو۔

(۳) اجازت دینے والا مختار ہو، اکراہاً اس سے اجازت نہ لی جائے۔

(۴) اس کی اجازت عمل جراحۃ یعنی سرجری ہی میں ہو، اگر وہ دواء وغیرہ سے علاج کی اجازت دے تو یہ اجازت سرجری کیلئے کافی نہیں ہے۔

(۵) اجازت کے الفاظ میں سرجری پر دلالت صراحۃً ہو، یا اس کی قائم مقام ہو۔

(۶) ماذون بہ یعنی جس سرجری کی اجازت دی جارہی ہے وہ شرعاً جائز ہو، محرمہ میں سے نہ ہو، جیسے: تغییر جنس کی سرجری۔ (ص:۲۵۲، ۲۵۴)

مسئلہ : جب مریض میں اجازت کیلئے ذکر کردہ پوری شرائط پائی جاتی ہوں اور اس سے اجازت طلب کی جائے تو اجازت دینا مستحب ہے۔ (ص:۲۵۶)

مسئلہ : اگر مریض کی ہلاکت کا، یا اس کے کسی عضو کے تلف ہونے کا خوف ہو، اور اس سے آپریشن کیلئے اجازت طلب کیجائے، اور وہ اجازت نہ دے، اور اسی مرض کی وجہ سے مرجائے تو وہ اپنے آپ کو قتل کرنے والا شمار نہیں ہوگا، اسلئے کہ سرجری سے صحت کا ملنا قطعی نہیں ہے، بر خلاف مخمصہ کی حالت کے، کہ اس میں ترک طعام سے گنہگار ہوگا۔ (ص:۲۶۱)

مسئلہ : دو حالتوں میں ڈاکٹر کو مریض اور اس کے ولی کی اجازت کے بغیر سرجری کرنا جائز ہے، (۱) اگر بالفور سرجری نہ کیجائے تو مریض کی موت، یا کسی عضو کے تلف ہوجانے کا خطرہ ہو، (۲) مریض کا مرض، وبائی امراض میں سے ہو، کہ اس کے پورے سوسائٹی میں پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ (ص:۲۶۲)

عمل تخدیر یعنی بے ہوش کرنے کے احکام (Anesthesia)

مسئلہ : بے ہوش کرنا اصلاً حرام ہے، اسلئے اس میں وقتی طور پر عقل زائل ہوجاتی ہے، جیسے کہ افیون، گانجا، حشیش، شراب سے ہوتی ہے، دونوں میں علت ایک ہی ہے، تو حکم بھی ایک ہی ہوگا۔ (ص:۲۷۷)

مسئلہ : چند حالتوں میں بے ہوش کرنا جائز ہے، اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) ضرروت، (۲) حاجت، (۳) ضرورت وحاجت سے کم۔

ضرورت: مریض کی ایسی حالت ہو کہ بے ہوش کئے بغیر سرجری کرنا محال ہو، جیسے: ہارٹ کا آپریشن، یا اس جیسے خطرناک آپریشن کہ اگر مریض کو بے ہوش نہ کیا جائے تو دوران آپریشن یا آپریشن کے تھوڑی دیر بعد مریض کی موت کا خوف ہو، تو ایسی صورت میں بے ہوش کرنا جائز ہے۔ (ص:۲۸۴)

حاجت: مریض کی ایسی حالت ہو کہ بے ہوش کئے بغیر سرجری کرنا محال نہ ہو، اور نہ ہی اس میں موت وہلاکت کا خطرہ ہو، لیکن مشقت شدیدہ کا سامنا کرنا پڑے، تو اس حاجت کو بمنزلۂ ضرورت قرار دے کر بے ہوش کرنا جائز ہے۔

ضرورت وحاجت سے ادنیٰ درجہ: مریض کی ایسی حالت ہو کہ اس کو بیہوش کئے بغیر سرجری کرنا ممکن ہو، اس میں مشقت تو ہو، لیکن ایسی مشقت نہ ہو کہ اس پر صبر کرنا ممکن نہ ہو، تو اس صورت میں بھی مریض پر آسانی کا معاملہ کرتے ہوئے بے ہوش کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (ص:۲۸۵)

جراحتِ عملی کے احکام

مسئلہ : بدن کے کسی عوض کو کاٹنا حرام ہے، لیکن ضرورت وحاجت کے وقت اپنے آپ کو موت وہلاکت، یا مشقت سے بچانے کیلئے جائز ہے۔ (ص:۲۹۷)

بواسیر کو کاٹنے کی تین حالتیں ہیں:

(۱) بواسیر کو کاٹنا حرام ہے، جب کہ اس کو کاٹنے سے ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

(۲) اس کا کاٹنا مباح ہے: جب کہ اس کے چھوڑے رکھنے سے ہلاکت کا خوف ہو۔

(۳) اس کا کاٹنا مکروہ ہے: جب کہ کاٹنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ ہی رکھ چھوڑنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو۔ (ص:۳۰۲،۳۰۳)

زائد انگلیوں کو کاٹنے کی دو حالتیں ہیں:

مسئلہ : (۱) زائد انگلیوں کو رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو، تو اس وقت ان زائد انگلیوں کو کاٹنا جائز نہیں ہے، اسلئے کہ یہ تغییر فی خلق اللہ ہے، اور تغییر فی خلق اللہ حرام ہے۔ (ص:۳۰۵)

مسئلہ : (۲) زائد انگلیوں کو رکھنے میں تکلیف ہو، اور اس تکلیف کو ختم کرنے کا کوئی دوسرا علاج نہ ہو، سوائے ان انگلیوں کو کاٹنے کے، تو اس صورت میں ضرورتاً ان زائد انگلیوں کو کاٹنا جائز ہے۔ (ص:۳۰۸)

ضرورت سے زائد عضو کو کاٹنے کا حکم

مسئلہ : انسان کے عضو کو کاٹنا اصلاً ناجائز وحرام ہے، اور ضرورتاً جائز ہے، تو اس پر واجب ہے کہ جتنی ضرورت ہو اسی پر اکتفار کرے، زیادہ کاٹنا حرام ہے۔ (ص:۳۱۱)

(ورم) سوجن کو جڑ سے ختم کرنے کا حکم

مسئلہ : ورم؛ اورام حمیدہ: گوشت یا رگوں میں گانٹھ کا پیدا ہونا، جس کا نمو غیر طبعی ہوتا ہے، یہ کسی آفت یا بیماری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایسے ورم جو لا علاج نہ ہوں (Good Swalling) کہلاتے ہیں، یہ وہ سوجن ہے

جس کا نموسست ہوتا ہے، اور اسکو باہر کا غلاف گھیرے ہوئے ہوتا ہے، یہ محدود ہوتی ہے، خون وغیرہ میں منتقل نہیں ہوتی ہے، اس سوجن میں سلامتی غالب ہوتی ہے، اسلئے اسکو جڑ سے نکالدینا جائز نہیں ہے، ان کو ہلکے پھلکے ورم یعنی اورام خفیفہ (Soft Swalling) بھی کہا جاتا ہے۔ (ص:۲۱۴)

(۲) ایسے ورم جو لاعلاج ہوتے ہیں، اورام خبیثہ: (No, Good Swalling) کہلاتے ہیں، یہ وہ سوجن وگانٹھ ہے کہ اس کا نمو تیزی سے ہوتا ہے، اور وہ جسم میں پھیل جاتی ہے، یہ دو مجموعے پر مشتمل ہے:

(۱) کینسر، (۲) سلحات (Tumar)، (گوشت میں پیدا ہونے والا ایک خطرناک ورم ہے) کینسر: جس کو ورم سرطان بھی کہا جاتا ہے، اس سوجن میں شدید خطرہ اور عظیم ضرر ہوتا ہے، کہ مریض کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، یہ سوجن خواہ جسم کے کسی متعین حصے میں ہو یا پورے جسم میں پھیل جائے اس کو نکالدینا جائز ہے۔ (ص:۳۱۶)

مسئلہ : کسی بیماری کی وجہ سی جسم میں گوشت کا بڑھ جانا، اس زائد گوشت کو نکالدینا جسم پر مؤثر ہوتا ہے، اسلئے اس کو نکالنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر دوا، وغیرہ سے علاج ممکن نہ ہو تو درء المفاسد کے قبیل سے اس کو نکالدینے کی اجازت ہے۔ (ص:۳۱۸)

بدن کو چیرنے کا حکم

مسئلہ : عمل جراحی کا ایک مرحلہ الشق ''یعنی بدن کو چیرنا ہے'' بدن کو چیرنا کبھی ضرورۃً ہوتا ہے جس میں موت سے بچنا مقصود ہوتا ہے، جیسے حاملہ کے پیٹ کو زندہ یا مردہ بچے کو نکالنے کیلئے چیرنا، جبکہ سرجری نہ کرنے کی صورت میں ان دونوں میں سے کسی ایک، یا دونوں پر ہلاکت کا خوف ہو، اور کبھی بدن کو چیرنا حاجۃً ہوتا ہے، جس میں ضرر لاحق، یا ضرر متوقع کا ازالہ کیا جاتا ہے، شق کی یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز ہیں۔

مسئلہ : انسان کے جسموں کی وہ پھٹن جو کسی آفت یا بیماری کی وجہ سے ہوجائے، اور علاجاً اس کو جوڑنا ضروری ہو تو شرعاً ان کو جوڑنا جائز ہے۔ (ص:۴۲۷)

مسئلہ : عورت کے پھٹے ہوئے پردۂ بکارت کو جوڑنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ (ص:۴۳۲)

مسئلہ : سرجری کے بعد خون کے جریان کو بند کرنے کیلئے اگر اس عضو کو داغنے کی ضرورت ہو، تو اس عضو کو داغنا جائز ہے، اور ہر ایسی حالت جس میں طبیب داغنے کی ضرورت محسوس کرے تو داغنے کی اجازت ہے۔ (ص:۴۳۵)

اعضاء کی پیوند کاری

عضوکومنتقل کرنے اور پیوندکاری میں منقول منہ یعنی جس سے اس کا عضولیا جارہا ہے، وہ یا تو انسان ہوگا یا حیوان ہوگا۔

مسئلہ : اگرانسان ہے اور کافر ہے، تو اس کے عضوکومنتقل کرنا سعودی عربیہ کے بڑے علماء کے نزدیک جائز ہے، اوراس کے عضو سے مسلمان کے اعضاء کی پیوندکاری جائز ہے۔

مسئلہ : اگرمنقول منہ مسلمان ہے، تو اس کے اعضاء کومنتقل کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ زندہ ہو، یا مردہ ہو، اجازت دے یا نہ دے، کسی بھی صورت میں مسلمان کے عضوکومنتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

مسئلہ : اگرمنقول منہ حیوان (جانور) ہو، اور پاک ہو، جیسے وہ جانور جن کوشرعی طریقے پر ذبح کیا گیا ہوتو ان کے اعضاء کوانسانوں کی طرف منتقل کرنا شرعاً جائز ہے۔

مسئلہ : اوراگر جانور پاک نہ ہو، تو اس کے اجزاء سے انتفاع، اوران کوجسم انسانی منتقل کرنا جائز نہیں ہے، مگر بوقت ضرورت، جبکہ کوئی دوسرا پاک عضونہ مل پائے جائز ہے۔

الثقب (چھید کرنا، سوراخ کرنا)

مسئلہ : الثقب: چھید کرنا، سرجری کے مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ہے، اصلاً ممنوع ہے، اسلئے کہ اس میں جسم کے ایک جزء کوتلف کرنا لازم آتا ہے، لیکن بوقت ضرورت فقہاء نے چھید کرنے کی اجازت دی ہے، جیسے کہ اگر بچے کی مقعد کا راستہ خلقی (پیدائشی) طور پر بند ہو، تو اس کوکھولنا، اوراگر پیشاب کا راستہ بند ہوتو اس کوکھولنا۔

مسئلہ : عملیۂ تجمیل اذن (Ear beautifying Surgery): عورتوں کی زیب وزینت کیلئے ان کے کانوں میں سوراخ کرنا تاکہ وہ بالیاں لٹکائیں جائز ہے۔ (ص: ۴۰۷)

مسئلہ : سرجری کے درمیان کاٹے ہوئے عضوکواس کی جگہ پرلوٹانا جائز ہے، اسلئے کہ انسان کا مردار عضوبھی پاک ہے۔

مسئلہ : حداورقصاص میں کاٹے ہوئے عضوکواس کی جگہ پرلوٹانا جائز نہیں ہے، اگرچہ صاحب حق اس کی اجازت دیدے، صحیح تر قول کے مطابق، کیوں کہ اگراس کی اجازت دی جائے تو مقصدِ حد فوت ہوجائے گا۔

مسئلہ : مصنوعی اعضاء کے ذریعے سے اعضاء کی پیوندکاری کرنا بوقت ضرورت وحاجت جائز ہے۔

''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' غیروں کی نظر میں

از: مولانا تنویر خالد قاسمی
سیتامڑھی، بہار

حرف آغاز

مذہب اسلام اس دنیا میں اس وقت آیا ہے، جب انسانیت دم توڑ رہی تھی، انسانی ظلم وجور پر ظلم کی تاریخ بھی آنسو بہا رہی تھی اور عدل ومساوات کی روح تقریباً عنقا ہوچکی تھی۔ اسلام نے ایسے نامساعد حالات کے باوجود انصاف وبرابری کا نعرہ بلند کیا، اور عملاً بھی اس کی شاندار تصویر پیش کی، اور حاکم ومحکوم، آقا وغلام اور اونچ ونیچ کے ناہموار ٹیلوں سے بھرے صحرائے انسانیت میں عدل وانصاف، برابری ومساوات اور یکسانیت وہم آہنگی کے پھول کھلا کر ہر سو نسیم صبح چلادی۔

''مشتے از خروارے'' کے طور پر اسلامی مساوات میں ہم ''حقوق نسواں'' پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورت عالم گیتی پر جانوروں، بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ بے وقعت ومظلوم تھی، کو اسلام نے ذلت ونکبت کے تحت الثریٰ سے اٹھا کر بلندی وعظمت کے بام ثریا پر رونق افروز کردیا، اور اسے ایسے ایسے حقوق عطا کئے جس کا تصور بھی اسلام سے پہلے ناممکن اور معدوم تھا...، مگر آج جبکہ ہر طرف سے اسلام پر یورش ہورہی ہے اور طرح طرح کی بے جا تنقیدوں اور لغو اتہامات کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور اسلامی اقدار وروایات کو ناقص بلکہ ظلم اور عدم مساوات سے عبارت گردانا جارہا ہے اور زور شور سے اس بات کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو اس ناجائز حقوق سے محروم رکھا ہے، اور اس کے ساتھ عدل ومساوات کا معاملہ نہیں کیا، حالانکہ اگر عقل وخرد کو تعصب سے پاک وصاف رکھا جائے اور دل ودماغ سے منصفانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات آفتابِ نیم روز کی طرح عیاں ہوجائے گی، کہ عورت چونکہ تمدن انسانی کا محور ومرکز ہے، گلشن ارضی کی زینت ہے، اس لئے اسلام نے باوقار طریقے سے اسے ان تمام معاشرتی حقوق سے نوازا جن کی وہ مستحق تھی، چنانچہ

اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ قرار دیا، دیگر اقوام کے برعکس اسے ذاتی جائداد و مال رکھنے کا حق عطا کیا، شوہر سے ناچاقی کی صورت میں خلع کی صورت دکھلائی، وراثت میں اس کا حصہ مقرر کرایا، اسے معاشرہ کی قابل احترام ہستی قرار دیا اور اس کے تمام جائز قانونی حقوق کی نشان دہی کی، حاصل یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جس قدر حقوق دئے ہیں، خواہ اس کا تعلق ذاتی جائداد وراثت سے ہو یا شادی یا طلاق کا مسئلہ ہو، کوئی دوسرا مذہب اس کا عشر عشیر بھی پیش کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔

دوسری طرف اگر آج ہم افترا پردازوں کے نعرے اور ان کے نتائج پر غور کریں تو اس پرفریب نعرہ نے اس بے چاری کو اس کے سوا کچھ نہیں دیا کہ وہ دفتروں میں کلرکی کرے، اجنبی مردوں کی پرائیویٹ سیکریٹری بنے، تجارت چمکانے کیلئے سیلز گرل بنے اور اپنے ایک ایک عضو کو سربازار رسوا کرکے گاہکوں کو دعوت نظارہ دے... ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ طلاق کی شرح میں زبردست اضافہ، ناجائز بچوں کی بہتات، ایڈز کا شیوع، غرضیکہ تمام معاشرتی واخلاقی خرابیاں اسی نام نہاد ''آزادئ نسواں'' کا ثمرۂ تلخ ہے۔

اسلام نے عوتوں کو کتنی ترقی دی؟ کیسا بلند مقام عطا کیا؟ قرآن کریم کی لاتعداد آیتوں اور بے شمار احادیث سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے پوری دنیا کے سامنے حقوق نسواں کا ایسا حسین تصور پیش کیا اور عورتوں کے تئیں وہ نظریات اپنائے کہ اپنے تو اپنے غیر بھی اس مثبت ومساوی نظام عمل پر عش عش کر اٹھے، اور یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ اسلام ہی دراصل حقوق نسواں کا علم بردار اور حقیقی ضامن ہے۔ آج اگر مغرب اور مغرب پرست اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اسلام کو حقوق نسواں کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں، تو یہ صرف حقیقت سے چشم پوشی کرکے اسلام کو بدنام کرنے کی سازش کے تحت ہے، مگر

''پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے''

چنانچہ آج بھی بہت سے غیر مسلم مفکرین اور دانایانِ فرنگ اعتراف حقیقت کرتے ہوئے اسلام ہی کو صنفِ نازک کا نجات دہندہ اور حقوق نسواں کا پاسدار سمجھتے ہیں، چنانچہ اس بات کو بیان کرتے ہوئے کہ اسلام نے ہی عورت کو تمام معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حقوق دئے جن کا تصور قبل از اسلام بعید از قیاس تھی۔

''ای بلائیڈن'' رقمطراز ہیں ''سچا اور اصلی اسلام جو محمد ﷺ لے کر آئے، اس نے طبقہ نسواں کو وہ حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے اس طبقہ کو پوری انسانی تاریخ میں نصیب نہیں ہوئے

تھے (سنت نبوی اور جدید سائنس)

''ڈبلیو لائٹر'' لکھتے ہیں: عورت کو جو تکریم اور عزت محمد ﷺ نے دی وہ مغربی معاشرے اور دوسرے مذاہب اسے کبھی نہ دے سکے''۔

(Mohammadanism in religious system of the world) ''ای ڈرمنگھم'' حضور ﷺ کی تعلیمات کو سراہتے ہوئے اور اسلام کے عورتوں کی زندگی کے تبدیل کردینے کے تعلق سے لکھتا ہے: ''اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ محمد ﷺ کی تعلیمات نے عربوں کی زندگی بدل دی، ان سے پہلے طبقہ نسواں کو کبھی وہ احترام حاصل نہیں ہوسکا تھا جو محمد ﷺ کی تعلیمات سے انہیں حاصل ہوا، جسم فروشی، عارضی شادیاں اور آزادانہ محبت ممنوع قرار دیدی گئیں لونڈیاں اور کنیزیں جنہیں اس سے قبل محض اپنے آقاؤں کی دل بستگی کا سامان سمجھا جاتا تھا وہ بھی حقوق ومراعات سے نوازی گئیں۔(The Life of Mohammad)

ڈبلیو ڈبلیو کیش کہتے ہیں ''اسلام نے عورتوں کو پہلی بار انسانی حقوق دئے اور انہیں طلاق کا حق دیا''(The Eupensin of Islam)۔

حقوق نسواں اور اس کے چند اہم پہلو

عموماً عورتوں کو زندگی میں تین اہم مراحل سے گذرنا پڑتا ہے: (۱) پیدائش سے شادی تک (۲) ازدواجی زندگی (۳) شوہر کے بعد کی زندگی۔

پیدائش سے شادی تک۔

پہلے مرحلے میں یہ بات واضح ہے کہ ازدواجی زندگی تک جب ہی پہنچا جاسکتا ہے جبکہ وجود (پیدائش) کو بقا حاصل ہو، مگر اسلام سے پہلے انسان کے اندر صفت بہیمیت پوری طرح غالب آگئی تھی، چنانچہ صنفِ نازک کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا، تین سال، پانچ سال کی نوعمر بچیوں کو محض اسلئے پیوند خاک کردیتے تھے کہ ان کی ناک نہ کٹ جائے، کوئی ان کا داماد نہ کہلانے لگے، لیکن اسلام نے "واذا الموؤدة سئلت بای ذنب قتلت" کے جانفزا حکم کے ذریعہ اس فتنۂ دخترکشی کا سدباب کردیا اور ڈوبتی انسانیت کو حیات اور حوا کی بیٹی کو جینے کا حق دیا۔

''آئرینا میڈمکس'' (Women in Islam 1930) میں اسلام اور ماقبلِ اسلام عورت کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''محمد ﷺ نے ان چیزوں کو اپنی پسندیدہ قرار دیا ہے، نماز،

روزہ، خوشبو اور عورت، عورت آپ ﷺ کے لئے قابل احترام تھی، معاشرہ میں جہاں مرد اپنی بیٹیوں کو پیدائش کے وقت زندہ دفن کیا کرتے تھے، محمد ﷺ نے عورت کو جینے کا حق دیا'' (سنت نبوی اور جدید سائنس ۲)

''جنرل گلپ پاشا'' نے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ پر ایک کتاب لکھی ہے (The Life And Tims of Mohammad) وہ اس میں پہلے اسلامی حقوق وراثت کی تعریف کرتے ہیں اور پھر آگے لکھتے ہیں: ''حضور ﷺ نے لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا بالکلیہ خاتمہ کردیا'' (ایضاً)

''ریونڈ جی ایم راڈویل'' ایک انتہائی متعصّب عیسائی ہے، مگر اعترافِ حق سے اپنے آپ کو نہ روک سکا کہ قرآن نے خانہ بدوشوں کی دنیا بدل ڈالی، دختر کشی کو ختم کردیا، اور تعدد ازدواج کو محدود کرکے احسان عظیم کردیا، چنانچہ اس نے بے اختیار لکھ دیا ''قرآنی تعلیمات سے سیدھے سادے خانہ بدوش ایسے بدل گئے کہ جیسے کسی نے ان پر سحر کردیا ہو، اولاد کشی ختم کرنا، توہمات کو دور کرنا، بیویوں کی تعداد گھٹا کر ایک حد مقرر کرنا، وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو عربوں کے لئے بلاشبہ برکت اور نزول حق تھیں، گو عیسائی ذوق اسے تسلیم نہ کرے'' (فاران ستمبر ۱۹۷۶ء بحوالہ میری آخری کتاب)

دوسرا مرحلہ ''ازدواجی زندگی'' ہے۔

اس مرحلے میں عورت کو بہت کچھ نرم گرم سہنا پڑتا ہے، بسا اوقات شوہر کی شہوت اس سے پوری نہیں ہو پاتی تو وہ دیگر راہیں ڈھونڈتا ہے، اخلاقی وتہذیب کی حد کو پار کرکے بازاری یا ان جیسی عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم کرتا ہے اور پھر میاں بیوی کی زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی ہے، اسلام نے ان ہی خرابیوں اور نقصانات سے بچاؤ کے لئے ''تعدد ازدواج'' کی اجازت دی ہے، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے بڑے زور شور سے یہ کہتے ہیں کہ تعدد زوجگی میں عورتوں کا استحصال ہوتا ہے اور ان کا حق منقسم ہوکر رہ جاتا ہے اور سوکن کی شکل میں طرح طرح کی ذہنی، جذباتی اور معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پروپیگنڈہ کتنا مبنی برحقیقت ہے اور تعدد ازدواج میں کیا کیا مصالح مضمر ہیں؟ یہ انسانی فطری طریقہ ہے یا اس سے متصادم؟ اس قسم کے سوالوں کا جواب الحمدللہ بہتوں نے دیا ہے اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے تاہم یہ ضرور کہیں گے کہ اسلام سے پہلے بھی تعدد ازدواج کی رسم رہی ہے اور اس کے بعد بھی جاری ہے بلکہ اسلام نے تو اپنے متبعین کے لئے ایک حد مقرر کی ہے، جبکہ اسلام کے علاوہ میں اس کی کوئی تحدید نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی تعدداز دواج کی شکل پائی جاتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام میں قانوناً اور فطرۃً اور غیروں میں جانوروں کی طرح... یہ گرل فرینڈ کیا ہے؟ کوئی زہر ہلاہل کو قند کہہ دے تو کیا اس کی حقیقت بدل جائے گی اور قند بن جائے گا؟ نہیں! بلکہ مزید دھوکہ دہی اور فریب کا الزام لگے لگا۔

یہی قول مشہور Theosophist نیت بسنت کا ہے موصوفہ اسی پوشیدہ ازدواج پر روشنی ڈالتی ہوئی یورپ کی اخلاقی باختہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''مغرب میں جھوٹی اور نمائش یک زوجگی ہے بلکہ فی الحقیقت تعدد ازدواج ہے مگر کسی ذمہ داری کے بغیر۔ جب آشنا عورت سے مرد کا دل بھر جاتا ہے تو اسے وہ نکال باہر کرتا ہے اور اس کے بعد وہ کسبی عورت بن جاتی ہے، کیونکہ اس کا ابتدائی محبّ'' اس کے مستقبل کی ذمہ داری نہیں لیتا اور وہ تعدداز دواج والے گھر میں محفوظ بیوی اور ماں بننے کے مقابلہ میں سوگنا بدتر ہوتی ہے۔ جب ہم ہزاروں مصیبت زدہ عورتوں کو دیکھتے ہیں جو یورپ کے شہروں میں رات کے وقت سڑکوں پر ہجوم لگائے ہوئے چلتی ہیں تو ہمیں یقیناً یہ محسوس کرنا پڑتا ہے کہ مغرب کو تعدداز دواج کے سلسلے میں اسلام پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسلامی تعدداز دواج کے محاسن وفوائد اور مغربی تعدداز دواج کی قباحت ونقصان پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید رقم کرتی ہیں۔

''عورت کے لئے یہ کہیں زیادہ بہتر، کہیں زیادہ مسرت انگیز اور کہیں زیادہ عزت بخش ہے کہ وہ (اسلامی) تعدداز دواج کے سسٹم کے تحت زندگی گزارے، وہ ایک مرد سے متعلق ہو، حلال بچہ اس کی آغوش میں ہو اور وہ عزت کے ساتھ جی رہی ہو، اس کے مقابلے میں (یورپین تعدد ازدواج) کہ اس کی عصمت دری کی جائے، وہ سڑکوں پر نکال باہر کردی جائے، بسا اوقات ایک حرامی بچہ کے ساتھ جو غیر قانونی ہو، اس کی کوئی جائے پناہ نہ ہو، کوئی اس کی فکر کرنے والا نہ ہو، اس کی راتوں پر راتیں اس طرح گزریں کہ وہ کسی بھی راہ گیر کا صید زبوں بننے کو تیار ہو، مادریت کے شرف سے محروم سب کی دھتکاری ہوئی ہو۔ (Marrage commision report بحوالہ تعدد ازدواج: سید حامد علی)

والیٹر: ایک مشہور فرانسیسی مؤرخ ہے، تہذیب اسلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''میں آپ سے کہتا ہوں کہ وہ لوگ جاہل اور ضعیف العقل ہیں جو مذہب اسلام پر دیگر اتہامات کے علاوہ عیش پرستی وراحت کوشی کا الزام لگاتے ہیں، یہ سب اتہامات بے جا اور

صداقت سے مبرّا ہیں''۔

ڈاکٹر''موسیو لیبان''مصنف تمدن عرب رقم طراز ہیں:

مسلمان کی جائز کثرت ازدواج یورپ کے ناجائز کثرت ازدواج سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے، اسلام پر جس دریدہ ذہنی سے نکتہ چینی کی جاتی ہے اور جس بری صورت میں اسے پیش کیا جاتا ہے وہ فرضی مہیب صورت بھی یورپ کے موجودہ معاشرہ کے آگے کچھ حقیقت نہیں رکھتی، دراصل یورپین ممالک میں عصمت عنقار بن گئی ہے۔(اسلام اور تعدد ازدواج)

تیسرا اہم مرحلہ''شوہر کے بعد کی زندگی'' ہے۔

اسلام سے پہلے ہوتا یہ تھا کہ جب عورت غیر شادی شدہ ہے اس کی کفالت باپ کے ذمہ ہوتی تھی اور شادی کے بعد شوہر کے زیر دست رہتی، باپ سے اسے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔اس لئے ہندوستان وغیرہ میں جہیز کا دور دورہ ہوا کہ والدین سے وراثت تو ملتی نہیں اس لئے جہیز میں جو کچھ دے سکتے ہوں دے دیں اسی طرح شادی کے بعد اتفاق سے شوہر کا انتقال اس عورت سے پہلے ہوجائے تو عورت کو شوہر کی جائداد سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملتی تھی۔جس کا شاخسانہ ستی کی رسم ہے۔ بلکہ تمام مال غیروں کا ہوجاتا جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہوتا تھا، مگر اسلام نے آتے ہی اس رسم کا خاتمہ کردیا جس کی وجہ سے عورت جیتے جی مردہ بن کر رہ جاتی تھی۔اور قرآن کریم نے "والذین یتوفون منکم الخ" اور آیت میراث کے ذریعہ اس کا حصہ بیان کرکے اس فتنہ کا سدباب کردیا۔اسلام کی انہیں خوبیوں کو سراہتے ہوئے فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاولی لکھتے ہیں:

''اسلام نے عورتوں کی تمدنی حالت پر نہایت مفید اور گہرا اثر ڈالا ذلت کے بجائے عزت ورفعت سے سرفراز کیا اور کم وبیش ہر میدان میں ترقی سے ہم کنار کیا چنانچہ قرآن کا''وراثت وحقوق نسواں''یورپ کے''قانون وراثت''اور''حقوق نسواں''کے مقابلہ میں بہت زیادہ مفید اور فطرت نسواں کے زیادہ قریب ہے۔(سنت نبوی اور جدید سائنس)

پروفیسر D. S Margoliouth یورپی مصنف ہے جو اسلام اور پیغمبر ﷺ اسلام کی دشمنی، بہتان تراشی اور اعتراضات والزامات کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، مگر ضمیر کی آواز کو دبا نہ سکا چنانچہ وہ عیسائیت ویہودیت پر حقوق نسواں کے تعلق سے تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''دور جاہلیت کے عرب تو ایک طرف رہے، عیسائیت اور یہودیت میں بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ عورت بھی صاحب حیثیت اور مالک جائداد ہوسکتی ہے، یہ مذاہب اس کی اجازت نہیں

دیتے کہ عورت بھی مردوں کی طرح معاشی اعتبار سے خوش حال ہوسکے عورتوں کی حقیقی حیثیت ان مذاہب اور ثقافتوں ومعاشروں میں باندی کی سی تھی جو مرد کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرتی تھی۔محمد ﷺ نے عورت کو آزادی عطا کی، خودمختاری دی اور خوداعتمادی کے ساتھ جینے کا حق دیا۔(ایضاً)

دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر راجندر صاحب نے ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

تاریخی طور پر اسلام عورتوں کو جائداد کے حقوق دینے میں بہت زیادہ فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ بل سے قبل ہندو عورتوں کا جائداد میں کوئی حصہ نہیں تھا، حالانکہ اسلام مسلم عورتوں کو یہ حق ۱۴سو سال پہلے دے چکا تھا۔(The Stetement dehli)

حرف آخر

عورت چونکہ گھر کی زینت ہے اس لئے اس زینت کو نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لئے اسلام نے کچھ حدود قائم کئے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان پابندیوں سے عورت کو کوئی نقصان پہنچا ہو، اسے کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہو بلکہ یہ تو عین حیا اور غیرت ووقار کا تقاضہ ہے، انہیں خیال کا اظہار ہملٹن ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسلام کے احکام عورتوں کے بارے میں نہایت واضح ہیں، اس نے عورتوں کو ہر اس چیز سے بچانے کی کوشش کی ہے جو عورتوں کو تکلیف پہنچائے اور ان پر دھبہ لگائے۔اسلام میں پردہ کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے جتنا بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ وہ عین حیا اور غیرت ووقار کا تقاضہ ہے۔''

سرجان بیگٹ رقم طراز ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے عورتوں پر جو پابندیاں عائد فرمائی ہیں ان کی نوعیت سخت نہیں ہے بلکہ ان پابندیوں میں عورتوں کے لئے آسانیاں فراہم کی گئی ہیں۔''(محمد ﷺ بحوالہ سنت نبوی اور جدید سائنس)

غیروں کے اعتراف حقیقت کے بعد بلا اختیار قلب وذہن میں "ان الدین عند اللہ الاسلام" دھڑکرن بن کر دھڑکنے لگتا ہے اور مشاہدہ کی آنکھوں سے "ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم" کی تفسیر دیکھنے کو ملتی ہے۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ اعترافِ حق کے ساتھ ساتھ قبول حق کے بھی حصہ دار بن جاتے۔

دینی مدراس میں قواعد فقہ کی تعلیم

از: اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

''فقہی اصول وقواعد'' دین فہمی کی اساس اوراحکام شرعیہ کی کسوٹی ہیں، عصر حاضر کی علمی زبان میں ''قواعدُ تفسیرِ النصوص'' کی تعبیر اصولِ فقہ کے لیے مستعمل ہے یہ قرآن وسنت کی تشریح وتفہیم کا مقررہ منہاج ہیں، ان کی بنیادیں گہری اورستون مضبوط ہیں، شریعت کو باطل کی آمیزش سے پاک رکھنے کے لیے مدارکِ اجتہاد اور مقاصد شریعت پر گہری بصیرت رکھنے والے علمائے راسخین اور فقہائے عاملین نے ان کوفن کی حیثیت سے مرتب فرمایا ہے، انھیں اصول وقواعد کے مطابق احکام کی تشریح وتوضیح صحت وتحقّیق کی ضامن ہے۔

فقہی اصول وقواعد کی تدوین:

جب اسلام عرب سے عجم میں سرعت کے ساتھ پھیل رہا تھا، اسی وقت اس کی تدوین عمل میں آئی، اس وقت کی صورت حال کچھ اس طرح تھی:

۱- نئی قوم اپنے ماضی کے رجحانات کے ساتھ اسلام میں داخل ہورہی تھی، دین میں ان رجحانات کی آمیزش کا خدشہ تھا۔

۲- نئے نئے لوگوں کے ساتھ نئے نئے مسائل بھی اسلام سے اپنا حل طلب کررہے تھے، گویا اسلام کو ایک چیلنج درپیش تھا، جو مسائل قرآن وحدیث میں صراحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئے ہیں، ان کا حکم دریافت کرنا بڑا اہم مطالبہ تھا۔

۳- بعض منافقانہ ذہن رکھنے والے لوگوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر نصوص کی غلط تشریح کا آغاز کردیا تھا، ان کا اسلوب مناظرانہ اور مقصد اسلام کی شبیہ بگاڑنا تھا اور بس؛ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے، مگر اتنا ضرور ہوا کہ چند افراد کا گروہ ان کے موافق ہوگیا۔

انھیں حالات میں فقہائے امت کی باتوفیق جماعت نے چاہا کہ اسلام کے جزوی احکام کے لیے ایسے اصول وضع کیے جائیں، جن سے اسلام کی شبیہ بگڑنے سے بچ جائے، اور فروعی مسائل کو ایسے ستون سے باندھ دیا جائے، جو ہلائے نہ ہلے، انھیں اصول وقواعد کے مطابق تشریح، اسلام کی صحیح ترجمانی کی ضامن ہو، جو ترجمانی ان سے ہٹ کر ہو، وہ جادۂ استقامت سے ہٹی ہوئی کہلائے۔ فقہاء کی وہ جماعت جہاں فطری استقامت، سلامت روی، انقیاد واطاعت اور خلوص وللّٰہیت کے زیور سے آراستہ تھی؛ وہیں ان کے اندر نصوص فہمی، استنباطِ مسائل اور عربی زبان وادب کا ذوق سلیم اعلیٰ درجے کا موجود تھا، وہ قواعد وضوابط کے محتاج نہ تھے، وہ اپنے ذوق سلیم سے استفادہ کرکے احکام شریعہ سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

انھوں نے قرآن وسنت کے معانی تک پہنچنے کے لیے لفظی اور معنوی قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اس طرح اسلام غیروں کے دست برد اور باطل کی آمیزش سے محفوظ رہا، جب ''فقہی اصول وقواعد'' کی تدوین عمل میں آگئی، تو سارے اہل علم کے لیے آسانیاں پیدا ہوگئیں، اسلام کے خلاف نئے چیلنج کا سامنا کرنا آسان ہوگیا نئے مسائل کے حل میں جو دشواریاں پیش آرہی تھیں، سب ختم ہوگئیں، اس فن سے جہاں ائمہ متبوعین کا منہج اور استنباطِ مسائل کا طریقۂ کار معلوم ہوتا ہے، وہیں اس فن سے اسلامی قوانین اور احکام فرعیہ کے صحیح طور پر سمجھنے کا ذوق اور ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

اصول اور قواعد میں فرق

''اصولِ فقہ'' اور ''قواعد فقہ'' میں فرق ہے، ''اصولِ فقہ'' میں نصوص کے الفاظ ومعانی کی اقسام الفاظ کے ظہور وخفا، اجمال وتفصیل، اسی طرح الفاظ کے معانی پر دلالت کی جہتوں اور شکلوں سے بحث ہوتی ہے، اسی طرح نصوص سے تحقیق مناط اور تعیین علت کے بعد علت مشترکہ کی بنیاد پر احکام کی تخریج کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے، اور ''قواعد فقہ'' کے فقہائے کرام نے قرآن وسنت، عرف وعادت، مصالح ومقاصد شریعت وغیرہ کو سامنے رکھ کر ترتیب دیئے ہیں، فروعی احکام کی صحت وسقم کو ان پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، بعض احکام اُن قواعد سے مستثنیٰ ہوتے ہیں جو بظاہر منطبق ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ کسی دوسرے قاعدے پر متفرع ہوتے ہیں، مستثنیٰ احکام کو ان کے متعلقہ قواعد پر منطبق کرنا، آسان کام نہیں، اس کے لیے ایک طرف فقہی بصیرت اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے تو دوسری طرف فقہ کا وسیع مطالعہ اور قواعد سے احکام کی تفریع

اسی طرح عملی زندگی میں احکام اسلامی کی تطبیق کا ملکہ بھی ضروری ہے، ان اوصاف کے بغیر قواعد سے احکام کی تفریع میں لگنا ہی جائز نہیں، اس سے بڑی بڑی خرابیاں در آنے کا شدید اندیشہ ہے، ایسے لوگ اگر اس میدان میں آئیں گے تو ''فقہ اسلامی'' کے ساتھ ''نادان دوست'' والا معاملہ ہوگا، یہ لوگ اِسے ''بڑھیا کا طوطا'' بناڈالیں گے، یہ خطرہ اس وجہ سے بھی زیادہ ہوگا کہ فقہی قواعد؛ منطق، نحو، صرف اور اشتقاق کے قواعد کی طرح کلی نہیں ہوتے؛ بلکہ اکثری ہوتے ہیں، اکثر جزئیات واحکام ضرور اس پر منطبق ہوجاتے ہیں، لیکن مستثنیات کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے، جیسا کہ علامہ حمویؒ نے حاشیہ الاشباہ والنظائر میں اس کی صراحت فرمائی ہے: إذ هي عندَ الفقهاء حكمٌ أكثريٌّ لا كليٌّ يَنطَبِقُ على أكثرِ جزئياته (حاشیہ الاشباہ، ص:۶۶، الفن الاول، ط: فقیہ الامت دیوبند)

علامہ زیدالدین بن ابراہیم بن نجیمؒ کی کتاب ''الاشباہ والنظائر'' اس بات کی شاہد عدل ہے، جن لوگوں نے بھی گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا ہے، ان پر یہ باتیں بالکل عیاں اور واضح ہیں، مزید تشریح کی چنداں ضرورت نہیں۔

مدارس میں اصول وقواعد کی تدریس کا جائزہ

ہندوپاک کے مدارس میں عموماً، چار یا پانچ کتابیں اصولِ فقہ میں پڑھائی جاتی ہیں، اصول الشاشی سے پہلے تسہیل الاصول، معین الاصول اور آسان اصول فقہ جیسی کتابیں داخل درس ہوتی ہیں، پھر نورالانوار اور حسامی پڑھائی جاتی ہے، اور دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے، جہاں فنون کی تکمیل کا رواج ہے، وہاں مسلم الثبوت آخری کتاب مانی جاتی ہے۔ افتاء میں ''اصولِ بزدوی'' بعض جگہ داخل نصاب ہے، ممکن ہے کہ ''اصول سرخسی'' بھی کہیں پڑھائی جاتی ہو، اس لیے کہ اب وہ چھپ چکی ہے، طلبہ فارغ ہوجاتے ہیں، دورۂ حدیث شریف تک ''فقہی قواعد'' کی ہوا تک نہیں لگتی، جن طلبہ کا انتخاب ''افتاء'' کے لیے ہوتا ہے، بس انھیں کو ''فقہی قواعد'' کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کے لیے عموماً ذیل کتابیں پڑھائی جاتی ہیں:

(۱) الاشباہ والنظائر (۲) قواعد الفقہ (۳) دررالحکام

''الاشباہ والنظائر'' اگرچہ مطالعہ کی کتاب ہے، لیکن اسے درساً درساً پڑھایا جاتا ہے؛ چونکہ پورا پڑھایا جانا ممکن نہیں ہے؛ اس لیے پہلی جلد ہی پوری ہو پاتی ہے، اس میں صرف دو نوعیں ہیں

النوع الاول کے قواعد کلیہ چھ ہیں اور النوع الثانی کے انیس، اور ان قواعد کے تحت اکتیس ضابطے (ذیلی قواعد) ہیں، اس طرح قواعد کی جملہ تعداد چھپن ہوجاتی ہے۔

''قواعد الفقہ'' (مؤلفہ: مفتی عمیم الاحسانؒ) جہاں داخل نصاب ہے اور پوری پڑھائی جاتی ہے، وہاں کرخی کے چالیس اصول، اور فقہائے اربعہ کے درمیان آپسی اختلافی تہتر اصول، اسی طرح ''عام قواعد'' فقہ چار سو چھبیس پڑھائے جاتے ہیں؛ سب کی تعداد پانچ سو انتالیس (۵۳۹) ہوجاتی ہے۔

اسی طرح بعض مدارس میں ''دررالحکام'' سے چند قواعد کا انتخاب پڑھایا جاتا ہے، یہ ہے مدارسِ اسلامیہ میں فقہی قواعد کا پڑھایا جانے والا نصاب اور اس کا سرسری جائزہ۔

لمحۂ فکریہ

آج کی اس علمی اور فکری مجلس میں یہ غور کرنا ہے کہ: اگر ہمارے مدارسِ اسلامیہ میں فقہ اور قواعد فقہ پڑھنے والے طلبہ آخر اتنے فائق کیوں نہیں ہوتے، جتنے ہمارے اکابر واسلاف کے دور میں ہوا کرتے تھے؟ حالاں کہ ہم بھی وہی نصاب پڑھتے اور پڑھاتے ہیں جو ہمارے اکابر وبزرگان کے دور میں تھا، مزید یہ کہ آج علمی وسائل پہلے سے کہیں زیادہ مہیا ہیں، کتابت وطباعت کی مشکلیں ختم ہوگئی ہیں۔ بہت سی علمی کتابیں جن کو دیکھنے کے لیے اکابر کی آنکھیں ترس گئی تھیں، آج وہ بہت آسانی سے ہر طالب علم کو مل جاتی ہیں، جن کتابوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ ہوتی تھیں، آج سستی سے سستی قیمت پر مل جارہی ہیں، سی، ڈیز اور انٹرنیٹ سے اور بھی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان سب کے باوجود نتائج حوصلہ افزا نہیں، آخر اس کی کیا وجوہات ہیں؟

فقہی بصیرت میں کمی کی وجوہات

مقالہ نگار کے نزدیک اسکی متعدد وجوہات ہیں، بعض ان میں اہم اور بعض بہت ہی اہم ہیں:

۱- سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مدارس میں فقہی کتابیں پوری نہیں پڑھائی جاتیں، اکابر کے دور میں کتابیں پوری ہوتی تھیں۔

ایک سرسری جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ: ہمارے مدارس میں سب سے پہلے ''نورالایضاح'' پڑھائی جاتی ہے، وہ صرف عبادات کے مسائل پر مشتمل ہے، یہ بھی بعض مدارس میں پوری نہیں ہوتی۔ ''قدوری'' دوسال میں پڑھائی جاتی ہے، اس وقت طالب علم کا شعور کامل

اور بیدار نہیں ہوتا، بس کسی طرح کتاب پوری ہوجاتی ہے، بعض مدارس میں یہ دونوں کتابیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔

ان کے بعد ''شرح وقایہ'' کا نمبر آتا ہے، اس کی چار جلدیں ہیں، بہت سے طلبہ جانتے بھی نہیں کہ اس کی چار جلدیں ہیں، یا صرف دو؟ ان میں سے بھی پہلی جلد مکمل ہوتی ہے، اس میں صرف عبادات کے ابواب ہیں اور دوسری جلد کا کچھ ہی حصہ پڑھایا جاتا ہے، بقیہ دو جلدیں طباعت سے بھی محروم ہیں۔

پھر ''ہدایہ'' شروع ہوجاتی ہے، اس کی پہلی اور دوسری جلدیں بمشکل تمام اکثر مدارس میں پوری ہوتی ہیں، تیسری اور چوتھی جلد تو کہیں بھی پوری نہیں ہوتی، اسی پر فقہ کی تعلیم پوری ہوجاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مدارسِ اسلامیہ میں طلبہ عبادات کے ابواب تو اچھی طرح پڑھتے ہیں؛ لیکن معاملات وغیرہ کے ابواب تشنہ رہ جاتے ہیں، اس کے بعد ''افتاء'' میں داخل ہوجاتے ہیں، اس وقت جب وہ ''فقہی قواعد'' پڑھتے ہیں تو ان کو دو دشواریاں پیش آتی ہیں: (الف) قواعد کے تحت جو مثالیں بے پڑھے ابواب کی ہوتی ہیں، وہ ان کو اجنبی لگتی ہیں، یا تو وہ بالکل سمجھ میں نہیں آتیں یا بمشکل ذہن نشیں ہوتی ہیں۔ (ب) دوسری دشواری؛ بلکہ مجبوری یہ ہوتی ہے کہ قواعد کے تحت مثالوں کی تخریج میں وہ بے پڑھے ابواب کی مثالیں پیش نہیں کرسکتے۔

۲- ''علم فقہ'' یکسوئی کا طالب ہے، لیکن آج طلبہ اور اساتذہ کی مشغولیتوں کی کثرت نے یکسوئی کا بیڑا غرق کردیا ہے۔

۳- عربی زبان وادب کا ذوق پہلے کی طرح نہیں رہ گیا، پہلے ہر عالم اور ہر فقیہ کو زبان وادب کا قابل لحاظ ذوق ہوتا تھا، آج وہ بات نہیں رہی۔

۴- استنباطِ مسائل کا تعلق بڑی حد تک علومِ عقلیہ سے مناسبت پر ہے، اس فن سے فکر وتدبر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، حضرات اکابر کا ذہن علومِ عقلیہ کو پڑھ کر روشن اور تیز ہوجاتا تھا، آج اس طرف توجہ نہیں کے برابر ہے؛ اس لیے بھی گہرائی وگیرائی کا فقدان ہے، خصوصا علومِ ولی اللّٰہی کے دعویٰ کرنے والے حضرات اور مدارس کو اس کی طرف توجہ دینی چاہئے!

۵- چند سالوں سے فقہ وافتاء کے طلبہ بھی علم سے زیادہ محض سند کے حصول کی طرف متوجہ ہورہے ہیں، بعض طلبہ سوم یا چہارم عربی کے بعد دورۂ حدیث میں داخلہ لے لیتے ہیں، دیوبند کے بعض مدرسوں میں بھی ایسے واقعات پیش آرہے ہیں، بعض مختصر مدتی عالم کورس کرکے سند حاصل

کرتے ہیں پھر انھیں افتاء میں داخلہ کی خواہش ہوتی ہے، جبکہ مختصر مدتی کورس سے فقہ تو دور کی بات ہے، کسی بھی فن سے مناسبت نہیں ہو پاتی۔

۶- تنخواہوں کی قلت اور مہنگائی کی کثرت کی وجہ سے اساتذہ بھی غیرعلمی مشاغل میں مصروف نظر آتے ہیں، حیدرآباد اور اس طرح کے بڑے شہروں کی صورتِ حال یہی ہے، اساتذۂ کرام محض واجب ڈیوٹی کرکے امامت، خطابت اور دکان داری میں لگ جاتے ہیں، یہ ان کی مجبوری ہے؛ اس لیے جیسے تیسے عبارت حل کرکے طلبہ کو پڑھا دیتے ہیں، ان کو خود فن سے مناسبت نہیں ہوتی، تو طلبہ کو کیا آئے گا؟

حضراتِ اکابر کے دور میں ''قواعد فقہ'' کو باضابطہ نہیں پڑھایا جاتا تھا، افتاء میں فتویٰ نویسی کی تمرین کے ساتھ صرف ''رسم المفتی'' پڑھائی جاتی تھی، جس سے اُن کو ''اصولِ افتاء'' معلوم ہوجاتے تھے، وہ ''فقہ اسلامی'' کا محیط مطالعہ رکھتے تھے اور اساتذہ کی رہنمائی اور ان کے مشورے سے کسی ایک کتاب کا تفصیلی مطالعہ بھی کرلیتے تھے، علومِ عقلیہ میں مہارت کی وجہ سے کسی بھی مسئلہ کے ہر چہار پہلو پر غور وفکر کرنا اُن کے لیے آسان تھا، عربی زبان وادب کا ذوق ہونے کی وجہ سے ہر کتاب ان کے لیے آسان تھی، آج محض اردو کے فتاویٰ سے فتویٰ دے کر فقیہ اور مفتی کے مبارک لقب سے ملقب ہوجاتے ہیں اور محض اردو شرح سے کتاب حل کرکے اکابر اساتذہ کی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔

چند تجاویز

ان سب وجوہات کی بنا پر ضروری ہے کہ درج ذیل گذارشات پر توجہ دی جائے:

۱- فقہ اسلامی کے موجودہ نصاب کو نہ بدلا جائے؛ بلکہ طریقۂ تعلیم میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے!

۲- اساتذہ کو اتنی کم تنخواہ نہ دی جائے کہ وہ دوسری حرفت وتجارت کرنے پر مجبور ہوجائیں اور یکسوئی سے خدمت نہ کرسکیں! نیز اتنی زیادہ کتابیں نہ دی جائیں کہ ان کو مطالعہ وتحقیق کا وقت نہ مل سکے!

۳- شروع سے ہی نحو وصرف کے ساتھ عربی زبان وادب کی تعلیم پر توجہ دی جائے!

۴- فقہی کتابوں کی تدریس بڑے اور تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کی جائے، جو ایک طرف تو

رخصتوں کو کم کر کے نصاب کی تکمیل کی طرف توجہ دیں اور دوسری طرف طلبہ میں فقہی ذوق پیدا کرنے کے لیے ''فقہی قواعد'' کی وضاحت کے ساتھ ان پر مسائل کی تطبیق کریں، نیز عرف وعادت کے بدلنے اور زمان ومکان وغیرہ کی تبدیلی سے جو مسائل جزوی یا کلی طور پر بدل گئے ہیں، اُن کی نشاندہی کریں، عملی زندگی میں ان مسائل پر کس طرح عمل ممکن ہے؟ اس کی بھی وضاحت کریں، یہ طریقہ طلبہ کی استعداد کو دیکھتے ہوئے شرح وقایہ یا ہدایہ میں ضرور اپنائیں، نورالایضاح اور قدوری میں بیان کو مفصل کرنے کے بجائے اختصار سے کام لیا جائے؛ البتہ عملی زندگی میں تطبیق مسائل کی تفہیم کو نہ چھوڑا جائے، اس طریقہ سے استعداد پختہ ہوگی اور طلبہ میں فقہ کا ذوق پیدا ہوگا، اوران کے دل میں ''قواعد فقہ'' کی اہمیت بیٹھے گی، پھر جب وہ ''افتاء'' میں ''قواعد فقہ'' کا مطالعہ کریں گے تو ان کو اجنبیت نہ ہوگی۔

۵- ''افتاء'' میں بالالتزام ایک متن کا محیط مطالعہ ضرور کرادیا جائے، اس کے لیے ''ملتقی الابحر'' بڑی اچھی کتاب معلوم ہوتی ہے، اس کا فائدہ بہت ہوگا اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ قواعد پر جزئیات کی تطبیق کے لیے مطالعہ کا وسیع محیط اور گہرا ہونا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۶- ''افتاء'' میں فتاوی نویسی کی مشق صریح جزئیہ کی روشنی میں کرائی جائے، اگر صریح جزئیہ نہ ہوتو ''نظائر'' کی روشنی میں تمرین ہو، آج تک اکابر کا طریقہ یہی چلا آرہا ہے، نظیر کے تلاشنے میں خوب خوب تھکنا اور تھکانا بڑا ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

۷- ''قواعد فقہ'' دراصل مطالعہ کا فن ہے، لیکن اب اِسے باضابطہ درس میں پڑھایا جاتا ہے اور پڑھانے کا طریقہ اکثر دارالافتاء میں وہی پرانا ہے کہ استاذ صاحب نے ہر قاعدہ کی مثالوں کے ساتھ تشریح کردی اور طلبہ نے سمجھ کر یا بلا سمجھے سن لیا اور چلے گئے۔

قواعد فقہ کی تدریس کا طریقہ

ناچیز کے نزدیک یہ طریقہ زیادہ مفید نہیں، اس میں کچھ ضروری تبدیلی لانی چاہئے؛ تاکہ مزید بہتری پیدا ہوجائے، چوں کہ پہلے کی طرح طلبہ مطالعہ نہیں کرتے، اس لیے ایسا طریقہ جوان کو مطالعہ کی طرف متوجہ کرے وہی زیادہ مفید ہوگا، ناچیز نے دارالعلوم حیدرآباد میں ''الاشباہ والنظائر'' کی تدریس کا پانچ سال تجربہ کیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوا کہ تخریج وتمرین کا طریقہ اچھا اور بہتر ہے، مثلاً: ''الاشباہ والنظائر'' کی پہلی جلد میں چھپن قواعد پڑھائے جاتے ہیں، پہلے ان

سب کو یکجا کر کے زبانی یاد کرایا جائے، پھر تدریس کے ساتھ اولاً یہ تمرین کرائی جائے کہ سارے قواعد کن نصوص کی روشنی میں بنائے گئے ہیں، اُن معانی کے نصوص کی تخریج، پھر ان سے قواعد کے استخراج کی تفصیل لکھوائی جائے، اس کے لیے خود علامہ ابن نجیم کی تشریح اور حموی کا حاشیہ، اولین معاون ثابت ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ ''الفوائد الجنیۃ'' جو شوافع کی ''الاشباہ والنظائر'' کہلاتی ہے، اس سے بھی طلبہ تعاون لیں، اس لیے کہ اکثر قواعد اور ان کے مآخذ ملتے جلتے ہیں اس کے بعد اُن معانی کی نصوص مزید تلاش کرائی جائے، اس لیے کتابوں کی سی، ڈیز کا استعمال بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح طلبہ کو ''قواعد'' کی صحت کا اطمینان حاصل ہوجائے گا، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ غیر مقلدین کے اس اعتراض سے متاثر نہ ہوں گے جو یہ کہتے ہیں کہ فقہی قواعد کی کوئی اصل نصوصِ شرعیہ میں موجود نہیں یہ محض فقہاء کی بنائی ہوئی عبارتیں ہیں۔

جب سارے قواعد پر یہ کام ہوجائے، تب ''الاشباہ'' میں ذکر کردہ جزئیات کی تطبیق کی تقریر استاذ صاحب کریں اور زیادہ بہتر ہے کہ باری مقرر کر کے طلبہ سے ہی تقریر کرائی جائے، اس لیے کہ افتاء میں طلبہ بااستعداد ہوتے ہیں، البتہ مشکل مقامات کی تقریر لازماً استاذ صاحب ہی کریں، جب ایک قاعدہ پورا ہوجائے تو اس قاعدہ پر منطبق جزئیات کی تخریج فقہی کتابوں سے کرائی جائے، اگر طلبہ ایک دو مثال بھی صحیح تخریج کر کے لائیں تو ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، تاکہ ہمت پیدا ہو اور رسوخ فی العلم کی دولت سے بہرہ ور ہوں۔

''قواعد الفقہ'' (مؤلفہ مفتی عمیم الاحسانؒ) اگر پڑھائی جاتی ہو تو اس میں بھی قواعد کے ''حفظ'' کے ساتھ تخریج کی مشق کرائی جائے۔

قواعد کے حفظ کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب بھی کوئی مسئلہ اُن کے سامنے آئے گا، فوراً اُن کا ذہن قواعد کی طرف منعطف اور متوجہ ہوگا، کبھی نیا مسئلہ اگر سامنے آئے گا تو اس کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی۔

۸- تدریس کی حد تک فقہی قواعد پر مسائل کی تطبیق مشق وتمرین مفید ہے، فتویٰ نویسی میں محض قواعد سے فتویٰ لکھنے سے احتراز کیا جانا ضروری ہے، جیسا کہ ''رسم المفتی'' وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، اس سے ایک تو فتویٰ نویسی کا رائج طریقہ ٹوٹے گا، دوسرے فتویٰ نویس مسئلہ کو کچھ سے کچھ سمجھ لے گا، جس سے زحمتیں پیدا ہوں گی۔ رہے ماہر اور مشّاق فتویٰ نویس مفتیان کرام تو ان کے فتویٰ میں قواعد کا ذکر ہونا چنداں مضر نہیں۔ واللہ الموفق

پہلا صلیبی سامراج (۱) چند فراموش شدہ تاریخی حقیقتیں

از: عبدالمتین منیری، بھٹکل

نشأۃ ثانیہ کے اپنے ابتدائی دنوں میں یورپی ملکوں میں دوائی کی شیشیوں میں لکھی یہ عبارت کہ ہندوستان سے درآمد کی ہوئی یا دیار عرب سے درآمد کی ہوئی بہت سے مہم جویوں اور دولت کے متلاشیوں کے جذبہ کو ابھارتی تھی اور انہیں مشرق سے آنے والی قدرتی اشیاء مصالحہ جات اور عطریات جیسی دولت کے سرچشموں کی تلاش اور وہاں کے سفر پر اکساتی تھی۔

اس دور کے جغرافیائی انکشافات پر تحقیق کرنے والے ایک محقق پانیکار نے مصالحہ جات میں سے ایک اہم عنصر کالی مرچ کی اس زمانے میں قدر و قیمت کے بارے میں درست لکھا ہے کہ اب شاید کالی مرچ کی کاروباری لین دین میں زیادہ اہمیت نہیں رہی، لیکن (یورپ میں جغرافیائی انکشافات کے اس) دور میں یہ اپنی قدر و قیمت میں قیمتی پتھروں کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی، اس کے لئے لوگ سمندروں کے خطرات مول لیتے تھے، کالی مرچ کیلئے مرتے اور مارتے تھے۔(۱)

ایک دوسرے محقق نے کالی مرچ کی اس اہمیت کو بڑھاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ دیار روم میں بھڑکنے والی جملہ جنگوں کے پس پردہ کارفرما سبب ملبار کی کالی مرچ اور اس کی منڈیوں پر قبضہ کی چاہت تھی، اس چھوٹے سے کالے دانے نے ابتدائی عیسوی صدیوں میں دنیا کی نظریں اپنی طرف کھینچ لی تھیں (۲)

ایک دوسری حقیقت جو دور وسطی کے یورپ میں جسے ہم دور ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں مصالحہ جات کے بارے میں یہاں کے باشندوں کا یہ عمومی اعتقاد تھا کہ مصالحہ جات اور قیمتی پتھر جنت عدن سے آتے ہیں انہیں چار نہریں دنیا میں لاتی ہیں، جغرافیہ دان اپنے نقشوں میں اسے ایک گول دائرہ اور نصف دائرہ کی شکل دے کر وثوق سے بتاتے تھے کہ کہ یہ جنت یہاں واقع ہے، ان کا اعتقاد تھا کہ یہ جنت مشرق میں ایک بہت اونچی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں سے چاند کو

چھوا جاسکتا ہے، اسے چاروں طرف سے اونچی چہار دیواری گھیرے ہوئے ہے جنہیں ہرے درختوں کے پتوں نے گھیر لیا ہے، پھر اس کے اطراف قلعے ہیں (۳)

ہمیں معلوم نہیں کہ اس کہانی کے پیچھے کونسے عوامل کارفرما تھے، ہوسکتا ہے اس کا سبب اہمیت جتلا کر اس کی تجارت کو بڑھاوا دینا ہو، کیونکہ اس دیومالائی ادبی خیال نے مصالحہ جات اور قیمتی پتھروں کی قیمتیں بہت بڑھادیں تھیں، یہاں تک کہ دور وسطی میں مرچ کی طرح مہنگی ضرب المثل عام ہوگئی تھی، اس زمانے میں فرانس وغیرہ کے کلیساؤں میں زمین اور زکاۃ کا ٹیکس مصالحہ جات کی صورت میں طلب کرنا عام سی بات تھی، اس دور میں غلاموں اور باجگذاروں کو اپنی آزادی خریدنے کے لیئے کلیسائی آقاؤں کو ایک رطل کالی مرچ دینی پڑتی تھی، دوسری جانب یورپ کے زمین دارانہ دور میں مقررہ مقدار میں کالی مرچ کاشت کاری کی زمین کے کرایہ کے طور پر ادا کرنی پڑتی تھی (۴)

الف لیلہ میں عرب سند باد جہاراں کے قصوں نے مشرق میں مصالحہ جات کی جگہوں ان کی تجارت اور یہاں تک پہنچنے کے لئے درپیش مہم جوئی کی تکلیفوں کے بارے میں خواب وخیال اور خرافات کو بڑھاوا دیا، یہیں سے مصالحہ جات کی تجارت نے بین الاقوامی روابط اور تعلقات کو جنم دیا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں دور وسطی میں انہوں نے حلقہ وصل کا کام کیا، یہیں سے مسلسل مشرق ومغرب کے مابین تعلقات کی کڑیاں ملتی ہیں، وہ اس طرح کہ جن راستوں سے قافلے مشرق سے مصالحہ جات لے کر جاتے تھے وہ ایشیاء کو افریقہ سے ملانے والی اہم رگیں بن گئے اور وہ اشیاء جو اپنے اندر خوشبو اور اور خوش ذائقہ رکھتی تھیں اور اسی مناسبت سے انہیں عطارہ کی اصطلاح میں سمو دیا گیا تھا کئی صدیوں تک مشرق ومغرب کے مابین تبادلہ کی اہم چیز بن گئی۔

یہ اشیاء جہاں مشرقی ممالک اور جن شہروں اور بندرگاہوں سے گزرتیں انہیں مالا مال کردیتیں وہیں پر جہاں ان کی پیداوار ہوتی اور ان کی تجارت ہوتی وہاں کے باشندوں کیلئے مصیبتیں لے آتیں، یہ مصیبتیں آنی اس وقت شروع ہوئیں جب پوپ اربن دوم Pope Urban II (1042 – July 29, 1099) نے ۱۰۹۵ء میں فرانس کے شہر کلیرمونت میں ایک بڑے مجمع کے سامنے اعلان کیا کہ یہی خدا کا ارادہ ہے اور مغربی یورپ کے باشندوں کو دعوت دی وہ اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ صلیب اٹھا کر مقدس مقامات پر قبضہ کرنے اور انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھیننے کا وقت آگیا ہے اور پھر عربی اسلامی سلطنتوں کے خلاف یورپ کی صلیبی جنگیں شروع ہوگئیں، پھر جب اس جنگ کے بلاوے کو مغرب کے عیسائیوں کی تائید حاصل ہوگئی تو پھر صلیب

کی لکڑی کو اٹھانے اور پوپ اربن دوم کی پکار کو بلند کرنے کی ایک دوڑ شروع ہوگئی، ان جنگوں کے انہی نعروں نے گیارہویں صدی عیسوی میں عالم عرب واسلام میں صلیبی یورپی توسیع پسندی کی داغ بیل ڈالی۔ جہاں ان جنگوں سے یورپ کو فتوحات ملیں وہیں ان پر تجارتی فروغ اور وسعت کے افق کھل گئے۔

۴۸۹ھ/ ۱۰۹۶ء سے ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء تک جملہ دوصدیاں پہلی صلیبی جنگوں کا دور شمار ہوتا ہے، اس دوران ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء سے ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء میں صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں صلیبیوں کی شکست تک جملہ (۸۶) سال بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا، ان صلیبی جنگوں سے یورپ کے عیسائیوں کا کیا فائدہ ہوا، اس بارے میں فاضل مورخ ویل ڈورنٹ Will Durant یوں رقم طراز ہے۔

صلیبی جنگوں نے یورپ والوں کے مسلمانوں کے تجارتی وصنعتی طریقہ کار کو جاننے کے بعد ان میں پھرتیلے پن اور چستی کی روح بھردی، کیونکہ ان جنگوں سے انہیں سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف شہروں کے جائے وقوع سے انہیں آگاہی حاصل ہوئی، اطالوی تاجروں نے صلیبی جنگوں کے طفیل بحرمتوسط کی گذرگاہوں کے نقشے بنانا سیکھ لیا، جو راہب، مورخ اور خبرنویس صلیبی گھوڑسواروں کے ساتھ چلے تھے انہوں نے ایشیا کے ملکوں کی وسعت اور ان کے مختلف علاقہ جات کے بارے میں نت نئی معلومات حاصل کرکے یہ معلومات اپنے لوگوں تک پہنچائیں، جس نے ان کے دلوں میں ان علاقوں کی کھوج اور یہاں تک پہنچنے کی کشش پیدا کی، اس طرح (عیسائیوں کے) بلاد مقدسہ (فلسطین) کا سفر کرنے والوں، یہاں کے مقدس مقامات کے زائرین کی رہنمائی اور یہاں کی ریاستوں اور شہروں کی تفصیلات بیان کرنے والی کتابیں منظرعام پر آئیں، عیسائی طبیبوں نے یہودی اور مسلمان طبیبوں سے علم طب حاصل کیا، صلیبی جنگوں کے طفیل یورپ میں علم جراحت ترقی پذیر ہوا، اس طرح تجارت اور کاروبار صلیب کے زیرسایہ اور پیچھے پیچھے چلتے رہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صلیب کی قیادت تجارت نے کی ہو، گھوڑسوار صلیبی فلسطین میں مسلمانوں سے ہار گئے، لیکن اطالوی بحری بیڑے نے بحرمتوسط کو نہ صرف مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا بلکہ بیزنطینیوں سے بھی اس کا قبضہ لے لیا، یہ درست ہے کہ شہر وینس، جنوہ، پیزا، املفی، مرسلیا، برسلونہ صلیبی جنگوں کے قبل سے مشرق کے مسلم ملکوں سے تجارت کرتے اور تنکنائے باسفور اور بحراسود کو چیرتے آئے تھے، لیکن صلیبی جنگوں نے اس تجارت کے دائرہ کار کی

وسعت کو دور دور تک پھیلا دیا، قسطنطنیہ پر وینس والوں کا قبضہ، عیسائی زائرین اور جنگجوؤں کو فلسطین پہنچانا، مشرقی ممالک میں عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو کمک فراہم کرنا، مشرق سے یورپ کو غلہ کی درآمد وغیرہ اسباب سے تجارت اور بحری نقل وحرکت میں ایسی پھرتی آئی کہ جس کی نظیر رومی امپائر کی سربلندی کے ایام کے بعد نہیں ملتی، یہ تجارت اپنے ساتھ یورپ کے لئے بڑی مقدار میں ریشمی کپڑے، شکر اور کالی مرچ، ادرک، لونگ، الائچی جیسے مصالحہ جات لے آئی، گیارھویں صدی کے یورپ میں یہ سب چیزیں نایاب اور آسائشی ساز وسامان تصور ہوتی تھیں، اس تجارت سے مشرق سے مغرب کو بڑی مقدار میں مختلف نباتات جڑی بوٹیاں، اناج اور درخت منتقل ہوئے جن سے یورپ اس سے قبل اندلس کی اسلامی ریاست کے توسط سے متعارف ہوا تھا، ان نئی متعارف ہونے والی اشیاء میں مکئی، چاول، تل، لیموں، خربوزہ، آڑو، شفتالو، کھجور، چھوٹی پیاز جو کہ شالوت اور عسقلانی کہلاتی تھی، عسقلان ثغر سے کشتیوں پر مشرق سے مغرب کو منتقل ہوتے تھے، شفتالو کو عرصہ تک برقوق دمشق کہا جاتا تھا، اس طرح اسلامی ملکوں سے سفید ریشمی کپڑا، دمقس، موسلین، ساٹین، مخمل، کشیدہ کاری کئے ہوئے دوسرے کپڑے، غالیچے، رنگ وروغن، آٹا، عطریات، زمین داروں اور متوسط طبقہ کے گھروں کو مزین کرنے اور ان کے مردوں اور عورتوں کو آراستہ کرنے کے لئے جواہرات پہنچتے تھے، برونز اور صیقل کی ہوئی دھاتوں سے بنے آئینوں کی جگہ کانچ سے بنے اور دھاتوں سے ڈھکے آئینوں نے لے لی، یورپ نے مشرق سے شکر اور وینس کے آئینہ صاف کرنے کی صنعت سیکھی۔ (۵)

یورپ میں ہندوستانی مصالحہ جات کی اہمیت اتنی کیوں بڑھی اس سلسلے میں عبدالعزیز محمد الشناوی رقم طراز ہیں کہ:

اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں جب کہ ریفریجریٹر اور چیزوں کو ٹھنڈا کرکے جما دینے والے بڑے آلات معروف نہیں ہوئے تھے گوشت کو محفوظ رکھنے کے لئے ان مصالحہ جات کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی، اس زمانے کے یورپ کی آسائش زدہ اور خوشحال زندگی میں کھانا مشرقی مصالحہ جات کو ملائے بغیر نہیں کھایا جاسکتا تھا، اس پر مزید یہ کہ لونگ اور ادرک کا حکیمی نسخوں میں استعمال ہونے لگا تھا، یورپ کی عورتوں میں مشک وعنبر اور آب گلاب کی ضرورت بڑھ گئی تھی، یہ ضرورت اب کلیسا والوں کو بھی ہونے لگی تھی، انہیں بھی دھونی دینے کے لئے بخورات، عطریات، ہندوستانی جڑی بوٹیوں، افیم، کافور وغیرہ کی ضرورت پڑنے لگی تھی، جبکہ دوسری اشیاء، قہوہ، قیمتی

پتھر، ہاتھی دانت، غالیچے، ریشمی کپڑے، یورپی معاشرے میں اظہار مفاخرت اور دولت کے اظہار کے ذریعے بن گئے تھے۔(۶)

ان ہندوستانی مصنوعات کی تجارت سے تاجروں کو جو منافع حاصل ہوتا تھا اس کی تفصیل شہر وینس کے مورخ چارل ڈیل نے یوں بیان کی ہے: ایک کوئنٹل ادرک کی جو قیمت اسکندریہ میں گیارہ کروزاڈو (Crusados ستر برطانوی سنٹ کے برابر قدیم پرتگالی سونے کا سکہ) لگائی جاتی تھی۔ کالیکٹ میں اس کی قیمت چار کروزاڈو تھی، ایک کوئنٹل کالی مرچ کی جو قیمت ڈھائی تا تین وینسی سکہ (ڈوکیٹ Ducat ۳،۴۹۴ گرام سونے کا وینس اور خلافت عثمانیہ میں رائج سکہ) یہ مرچ اسکندریہ میں (۸۰) سے کم پر ملنا مشکل تھا باوجود اس کے تاجروں کے لئے یہ تجارت بہت منافع بخش تھی۔ ۱۵۰۳ء میں واسکوڈی گاما ہندوستان سے اپنے جہاز پر ساڑھے تین ہزار کوئنٹل کالی مرچ، دارچینی، ادرک، اور جوز الطیب لادکر لایا، جواہرات اور قیمتی پتھر ان کے علاوہ تھے، ان کی قیمت ایک ملین ڈوکیٹ لگائی گئی۔ جب کہ اس مہم کے اخراجات دو لاکھ ڈوکیٹ سے زیادہ نہ تھے، اس مہم میں مال لگانے والوں کو ملنے والا منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ تھا، لسبن کے دو ہزار ڈوکیٹ لگانے والے ایک گھر کو پانچ ہزار کا فائدہ ہوا(۷)

انہی صلیبی جنگوں کے جگر سے اطالوی بحری جمہوریتوں خصوصا جنوہ اور وینس کی بنیاد پڑی جنہوں نے روایتی راستوں سے مشرق کی پیداوار کو شام کے راستے یورپ لانا شروع کیا، اور وینس کے بحری بیڑوں نے مشرق کی محصولات کی یورپ درآمد شروع کی، دوسری جانب انہوں نے جنگجوؤں اور ان کے لئے راشن اور یورپین زائرین کو مملکت شام بھیجنا شروع کیا، جس کی وجہ سے تجارت اور جہازرانی کو ایسا بڑھاوا ملا جس کی نظیر رومن ایمپایر کے بعد نہیں ملتی، اور یورپ کے بازاروں کی دکانیں ریشمی کپڑوں شکر مصالحہ جات جیسے کالی مرچ ادرک لونگ اور الائچی وغیرہ کے ڈھیر سے بھر گئے، اور یہ اشیاء گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ میں سامان تعیش شمار ہونے لگیں(۸)

لیکن مشہور واقعہ حطین ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء اور بیت المقدس کی مسلمانوں کے ہاتھوں میں سقوط (اسی سال بحر اوسط کے مغرب میں مملکت پرتگال وجود میں آئی) اور پھر عکا ۱۲۹۰ء کا سقوط اور تدریجی طور پر ایوبیوں کے بعد آنے والے ممالیک (خاندان غلامان) کے دور میں دیار شام سے صلیبیوں کو نکال بھگانے کی وجہ سے اطالوی جمہوریتوں کے معاشی حالات کو سخت زک پہنچی اور یہاں کے بہت سارے مشہور کاروباری خاندان افلاس اور قلاشی کا شکار ہو گئے(۹)

یہاں سے تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جنوہ والوں نے فارس (ایران) کے منگولوں کے ساتھ باہمی تعاون اور افہام تفہیم سے ہندوستان کے بری راستے سے خلیج عرب (فارس) تک پھر یہاں سے بحراوسط کی مشرقی بندرگاہوں تک مصالحہ جات کی درآمد کا خاکہ بنایا، حالانکہ یہ سوچ نافذ العمل نہ ہوسکی، لیکن اس کے نتیجے میں مصالحہ جات کے علاقوں تک نئے راستے کی تلاش کی ان کی خواہش تیز تر ہوگئی، اس دوڑ کے نتیجے میں جنوہ اور وینس میں متعدد جنگیں چھڑ گئیں اور جنوہ کو بھاری تجارتی نقصان اٹھانا پڑا اور بحراوسط کی کئی ایک بندرگاہیں اس کی بالادستی سے نکل گئیں (۱۰)

لیکن وینس نے صلیبی جنگوں کے بعد شام میں ہونے والے نقصانات کی بھرپائی مشرق کی درآمدات کے دوسرے تجارتی شہروں قاہرہ اور اسکندریہ سے کی، جب کہ یہ دونوں شہر ہندوستان چین ملقا اور انڈونیشی جزیروں سے یورپ کے لئے آنے والے سامان تجارت کے اہم ٹرانزٹ پورٹ بن گئے، ان کی اہمیت مصر میں سلطنت فاطمی کی دور ہی سے ہونے لگی تھی، وینس نے اپنے تعلقات مصر شام اور حجاز کے ممالیک سلاطین سے مضبوط کئے اور بحراحمر اور خلیج عرب (فارس) کے راستے آنے والے مشرقی سامان تجارت پر اپنی مونوپولی مضبوط کی، اس غرض سے وینس نے اپنے چھ بحری بیڑے تیار کئے جن کی مدد سے پندرھویں صدی میں اس نے بے تحاشہ منافع کمایا جس سے ان جمہوریتوں کو بحراوسط کے اطراف اپنی چودھراہت قائم کرنے میں مدد ملی (۱۱)۔

یہاں سے وینس اور جنوہ کے تاجر قاہرہ اسکندریہ اور شام کے تاجروں کی دلالی میں دب سے گئے، اور ان کی حیثیت ممالیک سلاطین کے ماتحت شام ومصر کی سرزمین سے گذرنے والے سامان تجارت پر ٹیکس دے کر مال چھڑانے والے تقسیم کنندگان کی سی ہوگئی (۱۲)

یہ ٹیکس کبھی کبھار چیزوں کی اصل قیمت سے تین گنا زیادہ بڑھ جاتا تھا، لہذا پندرھویں صدی میں یورپ کا اصل ہدف عرب اور مسلمانوں کی سرزمیں سے گذرے اور ان کی وساطت کے بغیر براہ راست مصالحہ جات کے اصل علاقوں تک رسائی ہوگیا تھا۔

یورپ کے جغرافیائی انکشافات کی تحریک کا آغاز اس سے ایک صدی پیشتر مارکوپولو جیسے سیاحوں کے انفرادی طور پر کئے گئے سفروں اور مہم جوئیوں سے ہوگیا تھا (۱۳)

ایک دوسرا سفر یوگولینو دی فالڈو Ugolino de Vivaldo نے ۱۲۹۱ء میں ہندوستان پہنچنے کی غرض سے جنوہ سے جبل الطارق اور مشرقی ساحل افریقہ کا کیا تھا، لیکن بعد میں اس کے

نتائج معلوم نہ ہو سکے (۱۴)

پھر حکومتوں کی جانب سے مصالحہ جات اور سونے کی سرزمینوں تک رسائی کے لئے کوششیں شروع ہوگئی، اس کے ساتھ ہی ۱۳۰۰ء ۔ ۱۵۰۰ء کے دوران یورپ کی نشأۃ ثانیہ نے جسے اس وقت یورپ کی پیدائش نو کا نام دیا گیا تھا ان انکشافات میں کمک کا اہم فیکٹر ثابت ہوئی، خاص طور پر جب سے یورپ کے اہم شہروں میں سرمایہ دار طبقہ نے جنم لیا جس سے یورپ کی اقتصادیات کی ترقی میں مدد ملی، اس منفعت کے تبادلہ میں اس سرمایہ دار طبقہ نے جغرافیائی انکشافات کی مہموں کو آگے بڑھایا جس سے ظاہر ہوگیا کہ جو چیز آنکھوں سے اوجھل ہو وہ اپنے ساتھ دولت لے آتی ہے، اس پر آپ دور وسطی میں یورپ کی نشأۃ ثانیہ میں اثر انداز ہونے والے ان تہذیبی مراکز پر نگاہ دوڑائیں:

- جزیرہ نمائے ایبریا (اندلس)
- جزیرہ سسلی اور جنوب اٹلی
- دیار مشرق عربی (شام ومصر) صلیبی جنگوں کے دوران (۱۵)

حالانکہ اٹلی کے سمندری شہروں جیسے وینس اور جنوہ نے مشرق سے تجارت اور اس کی یورپ میں مونوپولی کے طفیل اقتصادی خوشحالی کا مزہ اٹھایا تھا، لیکن یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے نشانات اٹلی کے دوسرے شہروں فلورنس وغیرہ میں بھی نظر آنے لگے تھے، ان شہروں نے مشرق کی عربی اسلامی تہذیب سے خوب خوشہ چینی کی جس سے یہاں علم اور دانشوروں کی تحریک پھلی پھولی، لہذا یہ تہذیب میں یورپ کے دوسرے شہروں پر بازی لے گئے۔

اٹلی کے ان شہروں خصوصا جنوہ کے لوگوں نے چودھویں صدی میں اقتصادی حالات خراب ہونے پر یہاں سے اسپین اور پرتگال اور جزیرہ نمائے ایبیریا کو ہجرت کی، اس وقت یہ مملکتیں اسپین سے مسلمانوں کے وجود کو نیست ونابود کرنے اور اس جزیرہ نما سے اسلام کے نام لیواوں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور اس غرض سے یہاں کی مسلم مملکتوں کے ساتھ ان کی جنگیں اپنے عروج پر تھیں اور یہ ان کی اقتصادی شریانوں کو شمال افریقہ اور مشرق عربی سے کاٹنے کے لئے کوشاں تھیں (۱۶)

تو ان سائنس دانوں کے جنہیں اسلامی تہذیب وثقافت کے سرچشموں سے جغرافیائی اور فلکی معلومات دستیاب ہوئی تھیں ان کے ساتھ ملنے سے اس جغرافیائی انکشافات کی تحریک کو آگے بڑھانے میں زبردست مدد ملی، جس کے نتیجے میں بر وبحر اور کرہ ارضی اور اس کے اطراف سفر و

سیاحت کے بارے میں روشن افکار وخیالات اکٹھا ہونے لگے (یورپ میں جدید دور یورپ والوں کے نقطہ نظر سے ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء سے شروع ہوتا ہے جب قسطنطنیہ پر عثمانیوں کا قبضہ ہوا تھا اور مشرقی یورپ میں اسلامی عثمانیوں کی یلغار شروع ہوئی تھی)، یہاں تک کہ نئے یورپ کے دور کے آغاز میں یہ بات عام ہوگئی کہ مشرقی ایشیاء کا آخری سراچین جاپان اور مصالحہ جات کے جزیروں پر ختم ہوتا ہے (۱۷)

جس چیز نے عملی طور پر مصالحہ جات کے سرچشموں کی تلاش میں مہم جوئی اور جغرافیائی انکشافات کی تحریک کے آغاز کے بارے میں غور وفکر کرنے پر مجبور کیا وہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے اہم تہذیبی پہلو جیسے علمی اداروں کا قیام (اکیڈمیاں کتب خانے اور اسکول وغیرہ) تھے جو کہ افریقی یونانی لاطینی تحقیقات کی سرپرستی کرتے تھے اور علم آثار اور تاریخ کا اہتمام کرتے تھے، اور نئی ایجادات جیسے طباعت کے آلات اور بارود کی ایجاد تھی جس نے جنگی سسٹم میں زبردست انقلاب برپا کی تھی، اور متعدد فلکی آلات تک ان کی رسائی تھی جس نے علم البحار اور سمندری معلومات میں بڑا کردار ادا کیا، جیسے اسطرلاب قطب نما، متحرک گیر وغیرہ، ان سب نے جہاز رانی کے مفہوم کو وسعت دی اور قدیم بوسیدہ دیومالائی خرافاتی افکار وخیالات کو نکال باہر پھینکا، ایک نامعلوم کی تلاش میں یورپ کی جغرافیائی انکشافات کی تحریک کے راستے سے روڑے ہٹائے اور مشرق کے پانیوں تک پرتگالیوں کو پہنچنے کی راہ ہموار کی۔ (۱۸)

❁ ❁ ❁

حوالہ جات

(۱) Panikkar ,k.M, : Asia and Western Dominace (London1959) p.12

(۲) محی الدین الالوائی: مجلۃ ثقافۃ الھند، (۱۹۵۹) ۱۔۱۲ص ۳۲

(۳) Boies , penrose, Travel And Discovery In Renaissance (1402-1692)U.K 1960 p. 2

(۴) سونیا۔ی۔ ھاو: فی طلب التوابل، ترجمہ محمد عزیز رفعت، (القاہرہ، ۱۹۵۷) ص ۱۳

(۵) ول دیورنٹ، قصۃ الحضارۃ، عصر الایمان (بیروت ۱۹۸۸) ج ۴ باب ۲۳ Story Of Civilisation

(۶) عبدالعزیز محمد الشناوی، اور بافی مطلع العصور الحدیثۃ (القاہرۃ ۹۵۹) ص ۲۰۱

(۷) البندقیہ: جمہوریۃ ارستقراطیہ ص ۱۴۶

(۸) ول دیورنٹ، قصۃ الحضارۃ، عصر الایمان (بیروت ۱۹۸۸) ج ۴ ص ۶۸ Story Of Civilisation

(۹) رینیہ کلوزییہ، تطور الفکر الجغرافی، ترجمۃ عبدالرحمٰن حمیدہ (دمشق ۱۹۸۲) ص ۵۱

(۱۰) Panikkar ,k.M, : Asia and Western Dominace (London1959) p.23

(۱۱) اثر تحول التجارۃ العالمیۃ الی راس الرجار الصالح علی مصر وعالم البحر المتوسط ص ۲۷

(۱۲) رینیہ کلوزییہ، تطور الفکر الجغرافی، ترجمۃ عبدالرحمٰن حمیدہ (دمشق ۱۹۸۲) ص ۵۱

(۱۳) Boies , penrose, Travel And Discovery In Renaissance (1402-1692)U.K 10.11

(۱۴) Panikkar ,k.M, : Asia and Western Dominace (London1959) p.32

Boies , penrose, Travel And Discovery In Renaissance (1402-1692)U.K p17

(۱۵) عبدالعزیز محمد الشناوی، اوربا فی مطلع العصور الحدیثۃ (القاہرۃ ۹۵۹) ص ۲۰۱

فاروق اباظہ، اثر تحول التجارۃ العالمیہ الی راس الرجار الصالح علی مصر وعالم البحر المتوسط اثنار القرن السادس عشر (القاہرۃ ۱۹۸٦)

(۱٦) فیجی جی دی، تاریخ غرب افریقیا، ترجمہ وتعلیق السید یوسف نصر (القاہرۃ ۱۹۸۲) ص ۱۰۷

(۱۷) ھ۔ا۔ل۔فیشر، تاریخ اوربا العصور الوسطی، ترجمہ مصطفیٰ زیادہ وآخرون (مصر ۱۹۵۷) ۴٦۳

(۱۸) محمد حمید السلمان، الغزو البرتغالی للجنوب العربی والخلیج (ابوظبی ۲۰۰۴) ص ۵۔۱۲

❁ ❁ ❁

میرے قابل احترام اساتذۂ کرام

(۳)

شیخ المنطق والفلسفہ حضرت علاّمہ محمد ابراہیم بلیاوی نوراللہ مرقدہٗ

از: مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی

جَبَلُ الْعِلْم (علم کا پہاڑ) کی تعبیر اگر کسی عالم کے لئے موزوں اور مناسب ہوسکتی ہے تو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عالم اسلام کے علمی حلقوں میں ایک ہی نام ہوسکتا ہے اور وہ تھے حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی نوراللہ مرقدہٗ۔

حضرت مرحوم کا خاص میدان جس میں وہ امامت کا درجہ رکھتے تھے منطق اور فلسفہ تھا۔ بلاشبہ حضرت علامہ فن منطق اور فلسفہ پر حاوی تھے، فلسفے کے مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مسئلے کو اس خود اعتمادی کے ساتھ چند جملوں میں حل کردیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔

یہ تو ان لوگوں کا بیان ہے جنھوں نے حضرت علامہ سے منطق وفلسفے کی بڑی بڑی کتابیں حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، میر زاہد، مُلّا جلال اور قاضی کا درس لیا ہے۔

اس ناچیز کو دورۂ حدیث کے سال ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں حدیث کی کتاب ترمذی شریف حضرت علامہ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ خلافِ معمول اُس سال حضرت نے بغیر کسی ناغے کے نہایت پابندی کے ساتھ پورے سال سبق پڑھایا اور وقت پر کتاب مکمل کی... سالانہ امتحان کا پرچہ آیا تو سارے سوالات کتاب کے آخری حصے سے تھے، مجھے یاد ہے کہ چند طلباء کے علاوہ اکثر طلباء کاغذ قلم لیے بیٹھے سوچ رہے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ حضرت علامہ کی شہرت منطق وفلسفہ میں زیادہ ہے شاید حدیث میں وہ مقام نہ ہو، لیکن جب سبق میں شرکت ہوئی اور حضرت کی تقریریں سنیں تو اندازہ ہوا کہ آپ کو حدیث کے پڑھانے پر بھی منطق وفلسفہ سے کم قدرت نہیں ہے بلکہ ان فنون کی چاشنی سے حدیث کا رنگ کچھ اور نکھر آتا تھا۔

حضرت علامہ لمبی تقریر کرنے کے عادی نہ تھے، بات جامع اور مختصر ہوتی تھی، آپ کے درس کا صحیح لطف وہی اٹھا سکتا تھا جو اچھی طرح مطالعہ کر کے آپ کے سبق میں شریک ہو۔ حضرت علامہ کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ طالب علم کو فن سے مناسبت پیدا کر دیتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ کی علمی تحقیقات اور مسلک دیوبند پر بڑی گہری نظر تھی۔ ایک مرتبہ مولانا معراج الحق صاحب تشریف فرما تھے، بات مسلک کی چل رہی تھی، مولانا معراج الحق صاحب نے سوال کیا حضرت سے کہ کیا لغت میں بھی ہمارا مسلک ہے...؟ فرمایا....! ہے۔

حضرت کے درسِ حدیث میں شرکت کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عمر کے اس حصے میں حضرت علامہ کی دلچسپی علوم عقلیہ کے بجائے علوم دینیہ سے زیادہ ہوگئی ہے، اس لئے جس لگن کے ساتھ وہ حدیث کا درس دیتے تھے وہ ان کی خاص توجہ کو ظاہر کرتا تھا۔

فقہ کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو حضرت علامہ کسی طرح چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے، اس کی ایک مثال مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے تحریر فرمائی ہے:

مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، شوریٰ کے اکثر ممبران حضرت علامہ کے شاگرد تھے، جو نہایت احترام کے ساتھ ملاقات کے لئے حاضر ہوتے تھے اور ملاقات سے فائدہ اٹھا کر اپنے مسائل بھی حل کر لیتے تھے۔ چند ممبرانِ شوریٰ جن میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی بھی شامل تھے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے... مولانا اکبرآبادی نے سوال کیا کہ جن مقامات پر سورج کئی کئی مہینے کے بعد طلوع ہوتا ہے وہاں پانچ وقت کی نماز کیسے ادا کی جائے گی، کیوں کہ نماز کی ادائیگی کے لئے سبب وجوب وقت ہے اور وہاں وقت ہی نہیں ہے...؟۔

حضرت علامہ نے جواب دیا کہ: ''وقت سبب وجوب کہاں ہے، وقت تو صرف علامت ہے''... یہ تھا حضرت علامہ کا انداز کہ چٹکی بجاتے ایک جملے میں سارا مسئلہ حل فرما دیا۔

❁ حضرت علامہ کے وقار اور رُعب کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے میں بہت زیادہ قریب آنے کا موقع نہیں مل سکا، مگر دارالعلوم سے فارغ ہونے کے تقریباً دو سال کے بعد ۱۹۵۸ء میں جب میں درجۂ فارسی میں مدرس ہوا تو اس وقت حضرت علامہ ناظم تعلیمات ہو چکے تھے۔ پہلے تو مجھے یہی گھبراہٹ تھی کہ ان کی نظامت میں کیسے کام کروں گا، مگر دھیرے دھیرے قربت ہوتی گئی حضرت کی شفقتیں بڑھتی گئیں اور ان کے جوہر کچھ اور کھلتے گئے۔

اسی زمانے میں میں نے مسلم شریف پر کچھ کام کرنا شروع کیا اور مصفّٰی اور مسوّیٰ پر بھی کچھ

کام کا آغاز کیا تو اکثر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنی علمی مشکل ان سے حل کر لیتا۔

جب انھوں نے میری علمی دلچسپی دیکھی تو پہلے تو ذرا امتحان لیا اور جب میں ڈٹا رہا تو محسوس ہوا کہ کافی خوش ہیں اور متوجہ ہیں۔ اُن کے زمانے میں میاں اختر حسین صاحبؒ نائب ناظم تھے، انھوں نے مجھے بتایا کہ حضرت علامہ تم سے بہت خوش معلوم ہوتے ہیں، فرمارہے تھے کہ اس کو آگے بڑھانا چاہئے۔

مجھے پڑھانے کے زمانے میں یہ شوق رہتا تھا کہ ابتدائی کتابوں کے ساتھ ایک آدھ کوئی بڑی کتاب بھی میرے پاس رہے۔ اُدھر شعبۂ فارسی کے صدر مدرس صاحب اس میں رکاوٹ ڈالتے تھے، حضرت علامہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے صدر مدرس صاحب کو بلا کر کہا کہ اگر وہ پڑھانا چاہتا ہے تو پڑھانے دو، نہ پڑھا سکا تو خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا۔ اس طرح وہ حکمت اور تدبیر سے کام لیتے تھے۔ مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا تھا اور وہ برابر میرے حالات سے باخبر رہتے تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اعلیٰ درجے کے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی امور پر بھی ان کی پوری نظر رہتی ہے... علامہ نازک مزاج تھے، ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی... مزاج پرسی کے لئے گیا، طبیعت پوچھی تو خاموش رہے، میں نے سمجھا شاید سنا نہیں ہے، دوبارہ مزاج پوچھا، فرمایا مولوی صاحب بار بار نہیں پوچھتے مرض یاد آجاتا ہے۔

اصل میں حضرت علامہ بلا کے ذہین انسان تھے، جہاں ان میں اعلیٰ درجے کی علمی لیاقت تھی اور وہ واقعی علامہ کہلانے کے صحیح حق دار تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ روشن دل بھی تھے، اگرچہ ان کی شہرت علم کے میدان میں ہی زیادہ ہوئی، لیکن زہد وتقویٰ میں بھی ان کا مقام کچھ کم نہ تھا۔

❁ مشرقی یوپی کے شہر بلیا میں ۱۳۰۴ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ان کا خاندان پنجاب کے ضلع جھنگ سے جون پور آیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد بلیا میں آباد ہوگیا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم جون پور میں مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے خاص شاگرد مولانا ہدایت اللہ خاں اور مولانا فاروق احمد صاحب سے معقولات کی کتابیں پڑھیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے خاص شاگرد مولانا عبدالغفار صاحب سے دینیات کی تعلیم حاصل کی۔

۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، پہلے ہدایہ، جلالین وغیرہ پڑھنے کے بعد

۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سندفراغت حاصل کی۔

۱۳۲۷ھ سے لے کر ۱۳۸۷ھ تک تقریباً ساٹھ سال آپ درس وتدریس سے وابستہ رہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اسی سال میں مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم بنائے گئے، پھر عمری ضلع مرآباد کے مدرسہ میں کچھ عرصہ تک درس وتدریس میں مشغول رہے۔

۱۳۳۱ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں بلالیا گیا۔ ۱۳۴۰ھ سے ۱۳۴۴ھ تک مدرسہ دارالعلوم مئوضلع اعظم گڈھ اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (بہار) میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۴۴ھ میں آپ کو پھر دارالعلوم دیوبند میں بلایا گیا، ۱۳۳۳ھ کی روداد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''مولوی ابراہیم صاحب تمام علوم میں کامل الاستعداد ہیں، معقول وفلسفہ کی تمام کتابیں نہایت خوبی سے پڑھاتے ہیں، فلسفہ ومنطق اور کلام کے انتہائی اسباق صدرا، شمس بازغہ، قاضی مبارک، حمداللہ، امور عامہ کے علاوہ شرح مطالع، شرح اشارات وغیرہ پڑھاتے ہیں، طلبار کا بہت زیادہ میلان ان کی طرف رہتا ہے، نہایت خوش تقریر ہیں۔ غرض یہ ایک نہایت قابل قدر اور شہرت ووقعت حاصل کرنے والے مدرس ہیں۔''

۱۳۶۲ھ میں پھر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی، اولاً جامعۃ الاسلامیہ ڈابھیل میں مسند صدارت کو رونق بخشی، وہاں کے بعد کچھ عرصے تک مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارت تدریس کی خدمات انجام دیں اور بعدازاں بنگال میں ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام کے مدرسہ میں صدرالمدرسین رہے اور بالآخر ۱۳۶۶ھ میں پھر دارالعلوم دیوبند آگئے۔

۱۳۷۷ھ میں آپ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعد دارالعلوم کی مسند صدارت پر فائز ہوئے اور ناظم تعلیمات بھی مقرر ہوئے اور تاوفات آپ اسی منصب پر رہے۔

آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے اوپر ہے جو ہندوپاک، بنگلہ دیش، ایشیار اور افریقہ میں اپنے استاذ کا فیضان پھیلا رہے ہیں۔

❁ حضرت علامہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے بیعت بھی کی تھی اور آپ کے خاص شاگرد بھی تھے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنّوری جیسے معتبر عالم جو کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خاص

شاگردوں میں ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا بلیاوی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز محقق عالم اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ درسیات کی مشکل ترین کتابوں کے اعلیٰ ترین مدرس اور استاذ تھے۔ اپنی حیات طیبہ کا بہت حصہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تدریس وتعلیم میں ہی صرف کیا اور پورے ساٹھ برس تک تدریس علوم دینیہ کی خدمت انجام دی۔ ذکاوت، قوت حافظہ اور حسن تعبیر میں خصوصاً معقول ومنقول کی مشکلات کے حل کرنے میں یکتائے روزگار تھے اور ہندوپاک کے تقریباً تمام علماء کے بلاواسطہ یا بالواسطہ استاذ تھے اور اپنے علمی کمالات اور جامعیت کے اعتبار سے قدمائے سلف کی یادگار تھے۔''

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مجلّہ ''برہان'' کے اداریہ میں رقم طراز ہیں:

''ادھر عرصۂ دراز سے حدیث وتفسیر کے ساتھ اشتغال زیادہ ہوگیا تھا، انہیں کا درس دیتے تھے اور انہیں کا مطالعہ کرتے تھے۔ انابت الی اللہ اور روحانی کمالات ومزایا کی طرف بھی توجہ زیادہ ہوگئی تھی۔''

آخر میں لکھتے ہیں:

''عمر اگرچہ نوے کے لپیٹے میں تھی لیکن قوی اب بھی اچھے تھے۔ درس بھی دیتے تھے اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے انتظامی امور بھی سرانجام دیتے تھے۔ شوریٰ کے جلسوں میں گھنٹوں بیٹھے رہتے اور اس کی کارروائی میں شروع سے آخر تک پوری حاضر حواسی کے ساتھ شریک رہتے اور دوسرے معمولات بھی جاری تھے۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۶۷ء سے شوریٰ کا جلسہ شروع ہورہا تھا اس میں شرکت کی غرض سے ہم ۲۵ کو ہی دیوبند پہنچ گئے تھے اور وہاں ظہر کی نماز کے بعد ایک کمیٹی کی میٹنگ میں بیٹھے تھے کہ اچانک حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات کا ٹیلی گرام بمبئی سے موصول ہوا۔ حضرت الاستاذ کو مکان پر جب یہ اطلاع پہنچی تو حضرت شاہ صاحب کے ساتھ غایت درجہ کے روحانی اور باطنی تعلق کے باعث آپ پر اس کا بہت غیر معمولی اثر ہوا اور صاحب فراش ہوگئے۔

چنانچہ شوریٰ کا جلسہ تین دن تک رہا مگر آپ کسی ایک نشست میں بھی شریک نہ

ہوسکے۔ بہ ظاہر اسباب شاہ صاحب کا حادثۂ وفات ہی حضرت الاستاذ کی صحت کے اچانک سقوط، حملہ فالج اور پھر موت کا سبب ہوا۔''

❁ ان کی چند تصانیف میں سے ایک رسالہ ''مصافحہ'' اور رسالہ ''تراویح'' اردو میں ہے۔ فارسی میں ''انوار الحکمۃ'' جو منطق وفلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ سلم العلوم پر عربی حاشیہ ''ضیاء النجوم'' ہے۔ اور میبذی خیالی پر آپ کے لکھے ہوئے حواشی ضائع ہوگئے۔

آخر عمر میں جامع ترمذی پر حاشیہ لکھ رہے تھے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آسکی اور صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر کار ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء بروز چہارشنبہ، دوپہر کے وقت عالم آخرت کا سفر اختیار کیا۔

اور علم کا یہ خزانہ قبرستان قاسمی دیوبند میں دفن کردیا گیا۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کے اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

حضرت علامہ کا سراپا بڑا باوقار تھا، لمبا قد، بھرا ہوا موزوں جسم، چہرے پر خوبصورت داڑھی، آواز بھاری پُر جلال، ہر لفظ نپا تلا، لہجہ دھیما مگر دل کو چھو لینے والا۔

❁ ❁ ❁

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب: ایک ہمہ جہت شخصیت

۱۹۱۸-۲۰۰۹ء

از: حکیم عبدالحمید صاحب
ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب سابق استاذ جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند و سابق رفیق شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے وہ ایک عالم، صوفی، شاعر، حکیم، اور کہنہ مشق مدرس تھے۔

حضرت حکیم صاحب (جنہیں آج رحمتہ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے) سے میرا تعارف ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۷ھ میں اسوقت ہوا جب میں نے دارالعلوم سے درس نظامی سے فراغت کے بعد جامعہ طبیہ میں داخلہ لیا اسوقت سے (۱۰ر ستمبر ۲۰۰۹ء مطابق ۱۹ر رمضان ۱۴۳۰ھ) ۴۲ سال تک نیازمندانہ تعلق رہا جسے بیان کرنے کیلئے ایک کتاب درکار ہے۔

حکیم صاحب کا تقرر بحیثیت مدرس طب جامعہ طبیہ دارالعلوم میں ماہ اپریل ۱۹۶۳ء میں ہوا تھا اور تقریباً چھبیس سال تک جامعہ طبیہ میں پوری تندہی اور انہماک کیساتھ درس دیتے رہے اور بحمداللہ مرحوم کا درس بہت مقبول رہا جبکہ حکیم صاحب موصوف باضابطہ کسی طبی درسگاہ کے سند یافتہ نہیں تھے لیکن یہ انعام خداوندی تھا جو انہیں اپنے مرشد حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی دعاؤں کی برکت سے حاصل تھا جس کا اظہار مختلف طبی مضامین کی تدریس وتصنیف میں نمایاں نظر آتا تھا۔

۱۹۸۶ء میں جامعہ طبیہ دارالعلوم کے تحلیل ہوجانے کے بعد دارالعلوم کے تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی شعبہ شیخ الہند اکیڈمی سے وابستہ ہوکر تصنیفی، وتالیفی خدمات انجام دیتے رہے اور اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۹ھ کو اکیڈمی سے بھی بوجہ کبرسنی سبکدوش ہوگئے، مگر احقر سے ہمیشہ استاذی وشاگردی کا تعلق برقرار رہا اور احقر نے حکیم صاحب کی خدمت کو اخلاقی فریضہ سمجھ کر انجام دیا اور حکیم صاحب کو جو وظیفہ کبرسنی دارالعلوم کی طرف سے ملتا رہا اسے ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۹ء تقریباً

بائیس سال تک دارالعلوم سے حاصل کر کے حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجتا رہا اور اس خدمت کو بوجھ نہیں باعث فخر سمجھتا رہا۔

حضرت حکیم صاحب نے ایسے خاندان میں تربیت پائی تھی جس کی خمیر میں تعلیم، دینداری، شرافت، ضیافت، وجاہت، خوردنوازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

حکیم صاحب موصوف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل تھے جو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمتہ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے تھے اور آپ کے منجھلے بھائی مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب اعظمی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء ومدیر البعث الاسلامی لکھنؤ اور چھوٹے بھائی جناب ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب سابق پروفیسر نیشنل شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ اپنے اپنے حلقوں میں معروف ومشہور شخصیتوں کے حامل ہیں۔

حکیم صاحب کے معمولات کا حال یہ تھا کہ روزانہ کم ازکم ایک منزل کلام پاک کی تلاوت کرتے اور دلائل الخیرات پڑھتے میرا قیام حضرت حکیم صاحب کے حجرہ کے برابر تھا دیکھتا کہ تہجد پابندی سے پڑھتے تھے، پھر اشراق، چاشت، اور نماز باجماعت بالخصوص دارالعلوم کی قدیم مسجد میں خواہ سردی ہو یا گرمی یا موسلا دھار بارش ہو مسجد میں حاضر ہوتے اسی طرح اگر کسی مجلس میں ہوتے اور نماز کا وقت ہو گیا تو اٹھکر مسجد چلے جاتے چاہے کیسی ہی مجلس ہوتی۔

حکیم صاحب بعد نماز عشاء جلدی سوتے تھے تاکہ سحر خیزی میں رکاوٹ نہ ہو اہاں دوپہر میں نہیں سوتے تھے بلکہ اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔

حکیم صاحب چھوٹے بڑے سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور سبھی کی خیر خواہی پیش نظر رکھتے تھے اور اچھا ونیک مشورہ دیتے جسکی زندہ مثال خود احقر کی ذات ہے۔ ہوا یوں کہ جب احقر جامعہ طبیہ دارالعلوم سے فارغ ہوا تو اسی سال حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم نے یہ تجویز منظور فرمائی کہ جو طالب علم جامعہ طبیہ کے آخری سال میں اول نمبر سے پاس ہوگا دارالعلوم اسے عملی مشق کیلئے ہاؤس فزیشین رکھے گا اس سے طلبہ میں اچھا پیغام جائے گا اور اچھے اطباء تیار ہونگے بحمد اللہ احقر کے نام یہ قرعہ فال نکلا اور ہاؤس فزیشین کے طور پر جامعہ طبیہ حاضر ہوا اتفاق سے اس سال حکیم محمد عمر صاحب سابق پرنسپل جامعہ طبیہ حج کیلئے گئے ہوئے تھے مزید براں ایک استاذ کی جگہ خالی تھی اسلئے چند اسباق بند چل رہے تھے۔ تو اسوقت

احقر نے عبوری پرنسپل استاذی المکرّم قبلہ ڈاکٹر شمیم احمد صاحب سعیدی کے کہنے پر قانونچہ وغیرہ کے اسباق پڑھائے اسوقت نیابت اہتمام کے منصب پر حضرت مولانا معراج الحق صاحب فائز تھے انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے فرمایا کہ عبدالحمید سے کہہ دو کہ پڑھاتا رہے اور مجلس شوری سے اسکی توثیق ہوجائے گی مگر احقر نے کہا کہ کچھ خانگی مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے دیوبند نہیں رہ سکتا اور وجہ یہ تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اور احقر ہی گھر میں بڑا تھا اسلئے دیوبند رہنے میں پریشانی تھی چنانچہ میں نے انکار کردیا تو دارالعلوم نے اخبار میں اشتہار دیا کہ دارالعلوم کو ایک مدرس طب کی ضرورت ہے جب حکیم صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم نے اشتہار شائع کیا ہے تو موصوف نے بلایا اور کہا کہ تم کیوں نہیں پڑھانا چاہتے تو احقر نے مذکورہ وجہ بیان کی مگر حکیم صاحب نے مشفقانہ طور پر سمجھایا اور جب نہ مانا تو پدرانہ ڈانٹ پلائی اور ایک درخواست لکھ کر احقر کو تھمادی اور کہا کہ انٹرویو دو جب یہ درخواست لیکر قبلہ ڈاکٹر شمیم احمد صاحب کے پاس گیا تو بے حد خفا ہوئے اور فرمایا کہ جب بلا مقابلہ رکھے جارہے تھے تب تو انکار کردیا اور اب انٹرویو میں بیٹھوگے میں نے کہا جی ہاں تو فرمانے لگے چلو درخواست دو اور قسمت آزمائی کرو چنانچہ انٹرویو دیا جس میں اٹھارہ اطباء شریک ہوئے بحمداللہ میں کامیاب ہوا یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے اس وقت سے ۱۹۸۶ء تک تدریسی خدمات انجام دی اور ۱۹۸۶ء میں جامعہ طبیہ کے تحلیل ہونے کے بعد ناظم کتب خانہ کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہا ہوں مادرِ علمی سے یہ تعلق حکیم صاحب کے نیک مشورہ ودعا کا اثر ہے۔

حکیم صاحب کی مہماں نوازی کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم کی معمولی تنخواہ کے باوجود انکا اسٹو صبح سے شام تک بہت کم بجھتا تھا کھانے یا چائے سے تواضع ہوتی رہتی تھی عربی کی کہاوت تو پڑھی تھی کثیر الرماد یعنی جس کے زیادہ چولھا جلنے کی وجہ سے راکھ کا ڈھیر ہو وہ اسکے سخاوت کی نشانی ہوتی تھی لیکن اس جدید دور میں حکیم صاحب کا اسٹو دیکھ کر یہ کہاوت یاد آتی تھی اور پڑوس کیوجہ سے احقر بھی گاہے بگاہے مستفید ہوتا رہتا تھا۔ حکیم صاحب موصوف نے دارالعلوم سے چلے جانے کے بعد احقر سے بیان فرمایا کہ دارالعلوم سے آنیکے بعد محلّہ کی مسجد کی بجلی کا بل میں ادا کرتا ہوں اور حضرت والا قاری مبین صاحب داماد مرشدی حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو ہر مہینہ کچھ رقم بھیجتا رہتا ہوں جبکہ مدرسہ کا وظیفہ کبرسنی شروع میں چار سو اور انتقال کے وقت سات سو بیس روپئے تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب کی شخصیت کس صفتِ قلندری سے آراستہ وپیراستہ تھی۔

اور میں نے خاندانی صفت اسلئے بیان کی ہے کہ احقر کی حاضری ندوۃ العلماء لکھنؤ میں برادرعزیز مولانا محی الدین محمد طیب سلّمہٗ کی دور طالب علمی میں ہوئی اور ساتھ میں مولانا ابوالعاص صاحب وحیدی بھی تھے اسوقت قبلہ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان ہوئے اور خوردنوازی کا منظر دیکھا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب سابق پروفیسر شبلی کالج اعظم گڑھ سے ملاقات پر اسکا تجربہ ہوا اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو دینی، علمی، ودنیوی وجاہت سے نوازا ہے۔

رجال سازی

حکیم صاحب کے اندر اللہ رب العزت نے ایک خاص وصف یہ بھی رکھا تھا کہ آپ اپنے مخاطب سے مل کر اس کی افتادِ طبع کا احساس کر لیتے تھے، اور جو جس طبیعت اور مزاج کا حامل ہوتا تھا اسے اپنے مفید مشوروں سے اسی طرح کے مشغلوں سے وابستہ کر دیتے تھے۔ ایسے کتنے حضرات اس وقت میرے سامنے ہیں جنہیں حکیم صاحب نے قلم پکڑنا سکھایا اور کتنے ایسے ہیں جن کو ان کے مشوروں اور صحبتوں سے مہمیز ہوئی اور صاحب تصانیفِ کثیرہ ہو گئے اس مختصر تحریر میں اس وقت صرف ایک نام پیش خدمت ہے وہ ہیں جناب مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی استاذ تجوید وقرأت دارالعلوم دیوبند جن کی ۸۰ سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

ایک صاحب قلم شخصیت:

حکیم صاحب جب سے جامعہ طبیہ دارالعلوم تشریف لائے تھے اسیوقت سے تدریسی کام کے ساتھ ساتھ تصنیفی وتالیفی کام کرتے رہے چنانچہ کچھ قلمی کاوشیں انکی اسطرح ہیں ''مآثر امام اعظم''، ''طب نبوی''، ''امراض صدر وریہ''، ''میڈیکل انگلش اردو ڈکشنری''، ''سنگم'' کے نام سے اردو، عربی، انگریزی ڈکشنری، ''سوانح فراہی''، ''سوانح عطار''، ''سوانح ابوہریرہ''، ''کتاب الرحمہ''، ''شاداب افریقہ'' اور بہت سی غیر مطبوعہ کتابیں اور مسودے یادگار ہیں، جنہیں باری تعالیٰ مرحوم کیلئے صدقہ جاریہ بنائے، (آمین)

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

حضرت حکیم صاحب کی کمی کا احساس جہاں گھر والوں اور متعلقین کو ہوگا وہیں انکی رحلت سے احقر کا ذاتی نقصان یہ ہوا کہ ایک مشفق ومخلص مربی سے محروم ہوگیا احقر کو حضرت حکیم صاحب کی مخلصانہ ومربیانہ دعائیں تادم واپسیں یاد رہیں گی۔

موصوف کا انتقال ۱۹؍رمضان ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۰؍ستمبر ۲۰۰۹ء بروز جمعرات دن میں آٹھ نو بجے کے درمیان ہوا اور اسی روز بعد نماز عشاء تجہیز وتکفین ہوئی اور نماز جنازہ حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❁ ❁ ❁

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : **نور القمر فی توضیح نزھة النظر شرح نخبة الفکر**
مؤلف : حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی زید مجدہٗ
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
صفحات : ۳۶۰ قیمت: (درج نہیں)
ناشر : مرکز دعوت وتحقیق دیوبند، سہارنپور (یوپی)
ملنے کے پتے : دیوبند کے مشہور کتب خانے
تبصرہ نگار : اشتیاق احمد، مدرس دارالعلوم دیوبند

میرے سامنے حافظ ابن حجرؒ (۷۷۳ھ تا ۸۵۲ھ) کی بے نظیر تصنیف ''نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر کی شرح نور القمر'' ہے، حضرت حافظؒ کو اپنی اس تصنیف پر یک گونہ ناز تھا، اور وہ بجا بھی تھا؛ اس لیے کہ اصولِ حدیث کے ذخیرہ میں ان کی کتاب کی نظیر نہیں تھی اور آج تک نہیں ہے۔ انھوں نے حقیقی معنوں میں دریائے علم کو ایک مختصر سے کوزے میں سمو دیا ہے، اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ''حافظ ابن الصلاحؒ کے مقدمہ'' کی قبولیت کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا، ساتھ ہی اس کی انفرادیت ومرکزیت بھی متاثر ہوئی — تقریباً سات صدی سے ''نخبہ'' اور ''نزہہ'' کی تدریس کی طرح اس کی تشریح وتحقیق؛ اختصار وتعلیق اور نظم کرنے کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

یہ کتاب ہمیشہ سے دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا جزء رہی ہے اور دارالعلوم نے اپنی روایت کے مطابق ہمیشہ اس کتاب کی تدریس کو بھی ماہرِ فن اساتذہ ہی کے سپرد کیا ہے، عرصۂ دراز تک یہ کتاب دارالعلوم کے مایہ ناز استاذ، محقق وقت، احادیث ورجال کے ماہر حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی زیدہ مجدہ وعمت فیوضہ سے متعلق رہی، موصوف مادرعلمی کے ان سپوت میں سے ہیں جنھوں نے محض علم وتحقیق کے لیے اپنی زندگی وقف کررکھی ہے، وقت کا ایک ایک لمحہ مطالعہ وتحقیق ہی میں گذرتا ہے، ہمہ وقت وہ ہوتے ہیں اور ان کا کتب خانہ؛ جہاں ہمہ علمی کتابوں

کا ذخیرہ موجود ہے، بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جو تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملتیں۔ چوں کہ دارالعلوم میں اکثر ذہین وفطین طلبہ داخل ہوتے ہیں؛ بلکہ بعض پڑھ پڑھا کر یہاں آتے ہیں؛ اس لیے لازماً اساتذۂ دارالعلوم وسیع تر مطالعہ کے عادی ہوتے ہیں- ہر زمانے میں ایسے اساتذہ بھی رہے ہیں جنھوں نے مطالعہ وتحقیق اور تصنیف وتالیف کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنائے رکھا ہے- ان میں حضرت الاستاذ کا امتیاز یہ ہے کہ آپ ہمیشہ سے ہر کتاب کا فنی مطالعہ کرتے ہیں، گذشتہ چند سالوں سے آپ کے مطالعہ وتحقیق کا محور صرف احادیث اور ان کے اصول ہیں، آپ کی تدریس پُرعلم محققانہ اور مجتہدانہ ہوتی ہے، آپ کا موقف تحقیقی وتدقیقی ہوتا ہے، بہت سی جگہوں میں مصنف سے اختلاف بھی ہوتا ہے، مصنف کی بات سمجھا کر اپنے موقف کے دلائل کو بڑی سنجیدگی اور علمی اسلوب میں پیش کرتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ ذہین طلبہ آپ سے بہت متاثر رہتے ہیں، قارئین کرام ''نورالقمر'' میں ان باتوں کا مشاہدہ کریں گے اس لیے کہ پوری کتاب درسی انداز میں لکھی گئی ہے، آپ کے بیان میں کہیں پیچیدگی نہیں ہوتی جو باتیں بڑی تلاش وجستجو کے بعد دریافت ہوتی ہیں، ان کو بھی چند آسان اور عام فہم جملوں میں ادا کردیتے ہیں، پیرایۂ بیان کبھی مرعوب کن نہیں ہوتا، القائے درس کا انداز مسحور کن ہوتا ہے، آپ کے فیضانِ علمی کو طلبہ پابندی سے اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں۔ (یہ ہر طالب علم کا مشاہدہ ہے، ''عیاں راچہ بیاں'' قارئین اسے قصیدہ خوانی پر محمول نہ کریں، یقین نہ ہو تو سر کی آنکھوں سے دیکھ لیں!)

حافظ ابن حجر نے اپنا رسالہ ''نخبہ'' طلبہ کو پڑھایا تو طلبہ نے ان سے اصرار کے ساتھ شرح لکھنے کا مطالبہ کیا، اس طرح ''نزہہ'' وجود میں آئی (ص ۲۵)، اسی طرح حضرت الاستاذ نے طلبہ کے بے حد اصرار پر ہی اپنا گہربار قلم اٹھایا اور اپنی یادداشت سے علم وتحقیق کے جواہر پاروں کو کتابی شکل میں علوم کے شناوروں کے سامنے پیش کردیا، خود رقم طراز ہیں:

''مشکوٰۃ المصابیح کے درس کے ساتھ ''نزہۃ النظر'' کا درس بھی ایک عرصہ تک بندہ سے متعلق رہا، اس زمانہ میں طلبہ کا یہ اصرار رہا کہ درس ہی کے انداز پر اردو میں اس کی شرح مرتب کردی جائے تو عام طلبہ کو فہم کتاب میں بڑی سہولت ہوجائے گی، بندہ ان کے اس اصرار کو یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ درس کی تقریر اچھی طرح ضبط کرلی جائے تو یہ مشکل آسان ہوجائے گی؛ اس لیے مستقل کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن ان کا اصرار بدستور اپنی جگہ قائم رہا، پھر بعض وہ احباب جو اس وقت بحمداللہ درس وتدریس کی خدمت پر فائز ہیں، انھوں نے بھی اس کی خواہش ظاہر کی اور

اس شدومد کے ساتھ کہ میں اسے ٹال نہ سکا اور اللہ کا نام لے کر اپنے علم وفہم کے مطابق یہ کام شروع کردیا جو درمیان میں بعض عوائق کے پیش آجانے کے باوجود بفضلہٖ تعالیٰ پورا ہوگیا، اب یہ اردو شرح مسمّٰی بہ ''نورالقمر'' طلبۂ علوم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، خدا کرے کہ یہ شرح طلبہ کی مشکل کے حل میں مفید ثابت ہو تو بندہ اپنے حق میں اسے خوش بختی وسعادت سمجھے گا۔'' (ص:۱۶)

طباعت کے بعد راقم الحروف نے شرح دیکھی اور کچھ تعارف لکھنے کا ارادہ کیا تو حضرت الاستاذ نے فرمایا: ''اچھی طرح پڑھ کر لکھو اور کوئی قابلِ اصلاح بات ہو تو نشاندہی کرو؛ تاکہ اس کو درست کیا جاسکے''، ناچیز نے چوں کہ دارالعلوم حیدرآباد میں ''مشکوٰۃ اور کبھی سراجی'' کے ساتھ متعدد بار ''شرح نخبہ'' پڑھائی ہے اور دورانِ تدریس وہاں کے کتب خانہ میں اس کی جملہ متعلقات عربی اردو شروح وحواشی اور اصولِ حدیث پر لکھی گئی نئی اور پرانی کتابیں اپنی وسعت بھر دیکھی ہیں؛ اس لیے اس کتاب سے اپنے اندر ادنیٰ مناسبت محسوس کرتا ہے؛ چنانچہ بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا اور بحمداللہ سوائے کتابت کی اتفاقی ایک آدھ غلطیوں کے کوئی ایسی چیز نہیں پائی جس کی اصلاح کی ضرورت ہو، مطالعہ کے دوران درج ذیل خصوصیات سامنے آئیں:

۱- ضروری کلمات پر اعراب لگایا گیا ہے، مشکل جملوں کو ترکیب نحوی کی وضاحت کے ذریعہ آسان کیا گیا ہے۔

۲- ترقیم کے ذریعہ مفصل بحثوں کو منضبط کیا گیا ہے۔

۳- رموز املا نویسی کی پابندی کی گئی ہے۔

۴- انداز بیان تحقیقی؛ لیکن مرعوب کن نہیں ہے، پڑھنے کے ساتھ قاری کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے۔ درسی انداز میں بڑی اہم اہم بحثوں کو مختصر پیرائے میں آسان اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔

۵- جس طرح درس میں اعلام کے تراجم اور کتابوں کا تعارف آپ مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں، وہی انداز اس میں بھی ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ اس میں حوالے کے ساتھ ہے؛ تاکہ پڑھنے کے ساتھ قارئین کو اعتماد ہوتا رہے نسبتوں کی تحقیق اور مقامات کے محل وقوع کی تعیین بھی بڑے عمدہ انداز میں کی گئی ہے، بار بار پڑھانے کے باوجود راقم الحروف بعض نسبتوں کو صحیح اعراب نہ دے پایا تھا، اس کا احساس محض اس شرح کے دیکھنے کے بعد ہوا۔

۶- بعض لغوی الفاظ جو بظاہر مرادف معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن اصلیت ومادہ کے لحاظ سے ان میں فرق ہے، زیر تبصرہ تصنیف میں بعض اہم فروق بھی بیان کئے گئے ہیں، مثال کے لیے دیکھئے

اختصار واقتصار کے درمیان فرق (ص ۲۵)

۷- ہرنئی بات نئے عنوان سے شروع کی گئی ہے۔

۸- جہاں بحث طویل ہوگئی ہے وہاں ''خلاصہ'' کا عنوان بنا کر مختصر انداز میں لُب لباب کو لکھا گیا ہے۔ اور طوالت کی وجہ سے جہاں ربط ٹوٹتا نظر آتا ہے وہاں چند جملوں کو قوسین میں لکھ کر ربط بتا کر بات آگے بڑھاتے ہیں، یہی چیز شرح لکھنے کی بڑی محرک ہے۔

۹- ''نخبہ کو نزہہ'' کے درمیان قوسین میں لکھا گیا ہے پھر اردو شرح کو ممتاز کرنے کے لیے خط کھینچا گیا ہے۔

۱۰- حافظ ابن حجرؒ کی ہر بات پر آمنا وصدقنا نہیں کہا گیا ہے؛ بلکہ وہ باتیں جو محققین اور احناف کے لیے محل نظر ہیں ان سب پر مدلل گرفت کی ہے۔ (دیکھئے ص ۸۰، ۸۹، ۱۰۶، ۱۷۲ وغیرہ)

۱۱- لغت، حدیث اور اصول حدیث کی کتابیں بہت زیادہ دیکھی گئی ہیں، حوالہ جات سے ہر قاری اس کا اندازہ کرسکتا ہے، اگر اخیر میں سارے مراجع کی فہرست دی جاتی (جیسا کہ آج کل کا انداز ہے) تو شاید قارئین مرعوبیت کی حد تک متاثر ہوتے۔

غرض یہ کہ قارئین تبصرہ نگار کہیں یا قصیدہ خواں؛ یا "عینُ الرضا عن کلِ عیبٍ کلیلةٌ" کا مصداق بتائیں؛ حقیقت یہی ہے کہ میری نگاہ نے کوئی عیب نہیں دیکھا، یہ شرح طلبہ اور اساتذہ سب کے لیے مفید ہے، شرحِ نخبہ کے لیے کافی شافی ہے، اور اس کوتاہ بیں کی نظر میں اردو بلکہ عربی زبان میں بھی کوئی ایسی شرح نہیں ہے، جس میں یکجا اتنی تحقیقات آسان اسلوب میں جمع ہوں، جس سے حدیث شریف پڑھنے والے حنفی طالب علم کو اطمینان حاصل ہوجائے، اگر ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے طعنے کا خوف نہ ہوتا تو علامہ کشمیریؒ کا وہ تاثر (جو بیان القرآن کو دیکھ کر انھوں نے پیش کیا تھا) میں اپنے الفاظ میں پیش کرتا کہ اس شرح کے دیکھنے کے بعد اب یقین ہوا کہ بعض اردو شرح میں بھی علم وتحقیق عربی کی طرح موجود ہے— شارح زید مجدہ سے اخیر میں یہ درخواست ہے کہ: بہت اچھا ہوتا اگر یہ شرح عربی زبان میں منتقل ہوجاتی تاکہ عرب دنیا کے لیے بھی استفادہ کی راہ ہموار ہوجاتی۔

خلاصہ یہ کہ ''نورالقمر'' ان طلبہ اور اساتذہ کے لیے بہترین تحفہ ہے، جو تحقیق کے ساتھ ''شرحِ نخبہ'' پڑھنا چاہتے ہیں، کتابت، طباعت، کاغذ اور ٹائٹل سب معیاری ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں! (آمین)